بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی، علمی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر لکھے گئے تیس مضامین کا حسین مجموعہ

ستارۂ منزل

محمد آفتاب عالم بانکوی

ادارۃ النشر و التوزیع

دینی، علمی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر لکھے گئے تمیں مضامین کا حسین مجموعہ

ستارۂ منزل

محمد آفتاب عالم بانکوی

ادارة النشر و التوزیع

کتاب : ستارۂ منزل

مرتب : محمد آفتاب عالم بانکوی

صفحات : 132

سال اشاعت : -------

برائے رابطہ : aftabalamqasmi@gmail.com

فہرست مضامین

Dr. Abdullah Abbas Nadwi
Education Secretary
Nadwatul Ulama, P.O. Box No. 93,
Lucknow-226007 (India)

د. عبدالله عباس الندوی
المشرف علی شئون التعلیم
لندوة العلماء، ص.ب. ٩٣، لكهنؤ

Phones : 0091-522-2740486, 2740151 Fax : 0091-522-2787310

Ref: الرقم

Date 10-09-2003   التاریخ ١٢/رجب المرجب ١٤٢٤ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم سبیل السلام کی حاضری کے موقع پر جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان میں پختہ کار، تجربہ کار مدرسین اور وسیع النظر اصحابِ فن اساتذہ ہیں انہیں میں چند ایسے طلبہ سے ملاقات ہوئی جو تکمیلِ درجات میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اپنے مطالعہ کو وسعت دے رہے ہیں اور اساتذہ کی نگرانی میں دینی واجتماعی مضامین کا سلسلہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ انہیں توفیق یافتہ نوجوانوں میں مولوی آفتاب عالم بانکوی بھی ہیں جن کے مضامین کا مجموعہ الٹ پلٹ کر مختلف مقامات کا مطالعہ کیا، جن سطور پر میری نظر پڑی ان میں کلام کی شائستگی اور حسنِ بیان کا انداز نظر آیا، یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ وہ اس مجموعہ کو شائع کرنے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اور ہمت وتوفیق میں برکتیں مقدر فرمائے۔

عبداللہ عباس ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توثیق

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم امابعد:

تحریری صلاحیت کے اظہاراور قلم کے واسطہ سے خدمت کاایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی موضوع پر مستقل کتاب لکھی جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر مختصر مضامین لکھے جائیں اور رسائل واخبارات کے ذریعہ قارئین تک پہونچادیئے جائیں، یہ اپنے خیالات کی ترسیل کا تیز رفتار طریقہ ہے جو بسااوقات مفید تر ثابت ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی طرح کے ہلکے پھلکے دلچسپ اورسادہ وعام فہم زبان میں لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو دارالعلوم دیوبند کے موجودہ طالب علم اور مدرسہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے سابق طالب علم مولوی آفتاب عالم بانکوی زیدعلمہ نے اپنے قیام حیدرآباد کے دوران سپرد قلم کئے اور وہ وہاں کے اخبارات کے ذریعہ عوام تک بھی پہونچے، احقر نے اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوا کہ عزیز موصوف کو خالقِ کائنات نے عمدہ تحریری صلاحیت سے بہرہ ور کیاہے، اور وہ مستقبل میں معیاری تحریری خدمت انجام دے سکتے ہیں، ان کا انداز تحریر سلیس، سادہ اور شگفتہ ہے، مضامین کے موضوعات میں تنوع اور تازگی ہے، جس کا اندازہ فہرست کے مطالعہ سے ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عزیز موصوف کی سادہ ہیئت اور اُس پر اس مجموعہ کی تالیف کے پیش نظر ان کو "گدڑی میں لعل" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، دعاء ہے کہ رب ذوالجلال اس لعل کو مزید آب وتاب سے نوازے اور خدمت دین کی توفیق سے ہمکنار کرے، آمین۔ والسلام

محمد سلمان عفا اللہ عنہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

۲۵/ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ یکشنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

اسلام آفاقی اور ابدی دین ہے، یہ قیامت تک انسانی زندگی کے بارے میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا، جوں جوں وسائل بڑھتے جائیں گے، ان وسائل کے صحیح استعمال کے لئے اسلامی تعلیمات کی احتیاج بھی بڑھتی جائے گی، اسی پسِ منظر میں ہر عہد میں علماء انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے، اور ہر عہد میں پیش آنے والے واقعات پر احکامِ شرعیہ کی تطبیق کرتے رہے ہیں، اگر ہم اسلام کو قیامت تک باقی رہنے والا دین سمجھتے ہیں، اور یقیناً اس پر ہمارا ایمان ہے، تو ہر دور کے سماجی و اجتماعی مسائل کو حل کرنا اور ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی نشاندہی کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعۂ مضامین کے مرتب عزیزی مولوی محمد آفتاب عالم بانکوی سلمہٗ حالانکہ ابھی طالبِ علمی کے دور سے گذر رہے ہیں، لیکن انہوں نے اپنے تحریری ذوق کو پروان چڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے، عزیزی سلمہٗ بانکا صوبہ بہار کے متوطن ہیں، اور بہار اپنی مردم خیزی کے لئے ہمیشہ معروف و ممتاز رہا ہے، عزیزی سلمہٗ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم اہرو چلنا ضلع بانکا میں حاصل کی ہے، پھر متوسطات سے دورۂ حدیث تک جنوبی ہند کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے کسبِ فیض کیا۔

انہوں نے یہ مضامین روزنامہ ''ہمارا عوام'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن میں لکھے تھے،

مضامین کے عنوانات ہی سے یہ بات ظاہر ہے کہ مضمون نگار نے اپنے گردوپیش، پیش آنے والے سماجی مسائل کو پیشِ نظر رکھا ہے، یہ بہتر علامت ہے، راقم الحروف کو ان تمام مضامین کو پڑھنے کا موقع تو نہیں مل پایا، لیکن جا بجا دیکھنے کی نوبت آئی، دل خوش ہوا، اُمید ہے کہ ان شاء اللہ آئندہ ان کا شعور اور بالیدہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ ان سے دین وعلمِ دین کی بہتر خدمت لے گا، اللہ سے دعاء ہے کہ مؤلف کو علمِ نافع اور عملِ صالح سے حظ وافر عطا فرمائے، اور زیادہ سے زیادہ دین اور علمِ دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے،

وبالله التوفيق وهو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی
خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد
جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

۴/ شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ
یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء چہارشنبہ

پیش لفظ

یہ حقیقت روزِ روشن سے زیاں عیاں اور واضح ہے کہ دین اسلام ہی عنداللہ مقبول و پسندیدہ دین ہے اور تمام انسانوں کیلئے تمام ممالک کے بسنے والوں کیلئے اور تمام نسلوں اور ہر رنگ سے متعلق انسانوں کیلئے قیامت تک یہی دین دارین میں فلاح اور کامیابی اور آخرت میں عذاب الہی سے نجات اور رستگاری کا ذریعہ ہے اس کے سوا کوئی دین عنداللہ مقبول و پسندیدہ نہیں اور نہ فلاح و نجات کا ذریعہ ہے۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ نے اس دین کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے سخت ترین مصائب و شدائد برداشت کئے، اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر لوگوں کی عمر بھر اس مبارک عمل کی دعوت دیتے رہے، آپ نے اکیلا اور تنہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کام کا آغاز کیا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کی حیات طیبہ میں دس لاکھ مربع میل کے علاقے میں اسلام پوری طرح پھیل گیا۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین سے لے کر آج تک امت کے مقبول افراد یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے، اور ان شاء اللہ العزیز دیتے رہیں گے۔ جیسا روایت میں مذکور ہے "لاتزال طائفۃ من امتی" (مسلم شریف)

اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ سائنسی ترقیات، وسائل کی فراوانی، حقائق کا انکشاف، دنیا کا سمٹنا حتی کہ ایک کنبہ بن جانا اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید بھی۔ چنانچہ امت مسلمہ کے افراد نے ہر طرح کے وسائل سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے انہیں دین اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لئے استعمال کیا، ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر ان وسائل کا انتخاب کیا اور انہیں اپنی بساط، گنجائش اور وسعت کے مطابق استعمال کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے اور تا قیامت ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ مختصر سی کتاب ہے جو مختلف عناوین پر مشتمل ہے، ہر عنوان کے تحت مختصر مگر مناسب مضمون لکھا گیا ہے۔ در حقیقت یہ مضامین حیدر آباد کے ابھرتے ہوئے پسندیدہ روزنامہ عوام کے جمعہ ایڈیشن کے لئے لکھے گئے جو مذکور روزنامہ میں چھپ بھی چکے ہیں۔ مزید افادہ کے لئے انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے جو ایک اچھی مفید خدمت ہے، اللہ تعالیٰ اسے خوب خوب عام مقبول اور مفید بنائے، آمین۔

ان مضامین کے لکھنے والے اور ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے والے عزیزی محمد آفتاب عالم بانکوی سلمہ دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کے ہونہار طالب علم ہیں جو اس وقت دورۂ حدیث میں ہیں، اس جامعہ میں درجہ پنجم عربی میں شریک ہوئے، جب کہ ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم اہر وچلنا ضلع بانکا میں حاصل کی۔ اپنی اس کم عمری کے زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے یہ اچھا اور قابل قدر کام انجام دیا۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ سیرت طیبہ، مخلوق پر رحم و کرم، پانی وغیرہ کے استعمال کے شرعی طریقے، عصری اور گرد و پیش اور عالمی حالات اور مختلف امور پر تبصرے قارئین کے لئے دلکشی اور رغبت کا ذریعہ بنتے گئے ہیں۔

اس کتاب کے اکثر مقامات کو پڑھنے کا موقع ملا، خوشی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ سے امید ہے کہ آئندہ یہ ایک اچھے مضمون نگار، مصنف اور امت کے لئے مفید فرد بن سکیں گے۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ یہ اپنے اسلاف و اکابر کے نقش قدم پر قائم رہتے ہوئے اپنی عمر کے ہر دن اور ہر رات بلکہ ہر ساعت میں دین، علم دین اور امت مسلمہ اور عام انسانوں کے لئے بھی مفید خادم کی حیثیت سے کام کرتے رہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مقبول، مفید اور پسندیدہ بنائے، آمین۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد برکت اللہ قاسمی

صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

۱۰ / رجب ۱۴۲۴ھ، ۸ / ستمبر ۲۰۰۳ء چہار شنبہ نو بجے دن

تعارف

قلم متاع حیات ہے، وہ انسان کو ابدی زندگی عطا کرتا ہے، جگہ اور زمانہ سے بے نیاز ہو کر راقم الحروف کی تصویر کشی کرتا ہے گویا کہ وہ آئینہ ہے جس میں ظاہری شکل وصورت نہیں بلکہ استعداد ولیاقت کے نشیب وفراز کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے، دور دراز ملکوں میں بیٹھے ہوئے حضرات تحریر کی خوبی اور حسنِ انداز سے صاحبِ تحریر کی محبت وعظمت کی چھاپ پڑ جاتی ہے، یہ قلم ہی کا تواثر ہے کہ امام بخاریؒ ومسلمؒ پر صدیاں بیت گئیں مگر اب تک وہ زندہ اور تابندہ ہیں، امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ کی ہڈیاں بوسیدہ ہوگئیں مگر زبان مدح خوانی میں مصروف ہے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے ملاقات نہیں مگر ان کے تذکرہ سے نگاہیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں وہ محدثین وفقہاء جن کی تصنیفات اسلام کی ترجمانی کرتی ہیں اور جن کی ورق گردانی ہمارا شب وروز کا محبوب مشغلہ ہے، ان کے چہرے ناآشنا ہیں، مگر دل کے دریچے سے وہ اندر تک پہونچ جاتے ہیں، دل و دماغ پر انہی کی حکومت ہے اور آخر زمانہ میں مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ اور مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی قلمی جولانی نے انہیں وہ زندگی پُر بہار عطا کی ہے کہ رفتارِ زمانہ ان کی علمی قدروں کو کبھی دھندلا نہ کر سکے گی۔

قلم کا وجود نہ ہوتا تو خدا کی قسم شخصیتوں کے ساتھ علوم کے خزانے بھی روپوش ہو جاتے، نہ کتب خانہ ہوتا اور نہ لائبریری، نہ تفسیر ہوتی اور نہ تشریح اور دنیا جہالت کی تاریکی میں ہمیشہ کے لئے گم رہتی، اسی عظمت کی وجہ سے خالقِ کائنات نے قلم اور اس سے لکھی جانے والی چیزوں کی قسم کھائی اور اس بات کا احساس دلایا کہ قرطاس وقلم کے ذریعے دل ودماغ کے نقوش کی حفاظت کی جائے، تصنیف وتالیف اور تحریر وانشاء کی شکل میں اپنی صلاحیتوں کو متعدی بنانے کی فکر کی جائے تاکہ ایک کی صلاحیت سے دوسروں کو بھی استفادہ کے مواقع میسر ہوسکیں۔

خوش قسمت ہیں وہ اربابِ قلم کہ جن کے قلم کی رفتار میں تسلسل اور دوام ہے، جو ہمیشہ لکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں، عزیز محترم مولانا **محمد آفتاب عالم سبیلی** سلمہ اللہ تعالیٰ ان ہی خوش نصیب افراد میں سے ہیں جو ناموافق حالات میں بھی عزمِ جواں، بلند ہمت اور منزل پانے کی تڑپ رکھتے ہیں، گرچہ وہ میرے

علاقہ سے منسلک ہیں مگر میری پہلی ملاقات **دارالعلوم سبیل السلام** میں اس وقت ہوئی جب کہ روزنامہ "**ہمارا عوام**" کے ذریعے ان کی تحریر سے میں آشنا ہو چکا تھا، بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دیگر صلاحیتوں کے ساتھ تحریری ذوق وافر مقدار میں عطا کیا ہے، ان کی قلمی صلاحیت نے **دارالعلوم سبیل السلام** کے اساتذہ اور طلباء کی نظر میں انہیں عزت دی ہے اور وہ ماہنامہ "**رضوان**" کے مدیر بھی ہیں، **حیدرآباد** کا مشہور اور مؤقر اردو روزنامہ "**ہمارا عوام**" کے پلیٹ فارم سے ان کو خوب سنورنے، نکھرنے اور تحریری لیاقتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا، وہ ہر عنوان پر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں، ان کی تحریر میں مواد کی فراہمی، بیان کی شگفتگی اور حسنِ انداز سب کچھ ہیں، انہوں نے اپنی حسنِ تحریر کے ذریعے نہ صرف **دارالعلوم سبیل السلام** اور **حیدرآباد** بلکہ اخبار سے آگہی رکھنے والے تمام حلقوں میں اپنی امتیازی شناخت بنالی ہے، ہر ایک ان کو جانتے اور پہچانتے ہیں، دورِ طالب علمی میں اتنی شگفتہ تحریر لکھنے والے کی مثال شاید نہیں ہے، عام مولویانہ ذہن سے ہٹ کر انہوں نے جس راستہ کو اختیار کیا ہے وہ یقیناً قابلِ رشک ہے اور قابلِ تقلید بھی، تحریری اعتبار سے جس نے ہمیں سب سے زیادہ یہاں متاثر کیا وہ انہی کی ذات ہے، کھیل کود، لایعنی گفتگو اور بے فائدہ مجلسوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے مقصد کی تلاش ان کا اپنا مشن رہا ہے۔

پیشِ نظر کتاب روزنامہ "**ہمارا عوام**" حیدرآباد میں شائع ہونے والے بکھرے مضامین کا حسین مجموعہ ہے جس کا نام موصوف نے "**ستارۂ منزل**" منتخب کیا ہے، اس میں تیس مختلف دینی، سماجی، معاشی اور معاشرتی عناوین پر سیر حاصل مضامین ہیں، زبان میں سادگی وسلاست اور مواد کی کثرت نے افادیت کو اور دوبالا کر دیا ہے، لب و لہجے میں شائستگی اور نشیب و فراز میں توازن قائم ہے، کتاب کا معیار تقریباً ہر اعتبار سے بہتر اور قابلِ تحسین ہے، احباب ورفقاء کے پیہم اصرار کی وجہ سے عزیز موصوف نے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کیا ہے، اس امید کے ساتھ کہ عقیدت کے ہاتھوں لی جائے گی اور محبت کی نگاہوں سے پڑھی جائے گی۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ کتاب عزیز موصوف کے لئے حوصلے کے مہمیز کا کام دے، مزید لکھنے کا سلیقہ عطا کرے اور دین و دنیا دونوں جہاں میں کامیاب بنائے (آمین) **وما ذلك على الله بعزيز**۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی

استاذِ دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

وصدر کل ہند ادارۂ فکر وتحقیق باراہاٹ، بانکا

۲؍ جمادی الاول ۱۴۲۴ھ

۳؍ جون ۲۰۰۳ء سہ شنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

مذہب اسلام پوری انسانیت کے لئے کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہے اور یہی دینِ اسلام عند اللہ مطلوب اور مقبول ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آخری دین کی حیثیت سے نازل کر کے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اپنے ذمہ لے لی، چنانچہ اس کام کے لئے امت کے صالح علماء اور قوم و ملت کے خیر خواہ اور دینی جذبے سے سرشار افراد کو منتخب کیا، جنہوں نے ابتداء سے ہنوز تحریر و تقریر سے لے کر نظم و انتظام کے بے شمار طریقوں کو اپنا کر اس کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں، لیکن تحریر و تقریر نے اس میدان میں جو مؤثر کردار ادا کیا ہے، اس کا انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔

اسی پس منظر میں مادر علمی **دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد** اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے ساتھ تحریر و تقریر میں بھی نمایاں حیثیت کی حامل ہے اور رہا ہے، جس نے **"انجمن الفلاح"** کے نام سے ایک مستقل لائبریری قائم کر کے، پھر اس کو چند ذیلی شعبوں میں تقسیم کر کے، طلبہ کے اندر پائی جانے والی مخفی صلاحیتوں کو نکھار کر خوب سے خوب پروان چڑھایا ہے، چنانچہ احقر کو بھی ان سے استفادہ کا بڑا سنہرا موقع ملا۔

احقر کے چند مضامین سالِ گذشتہ شہر حیدرآباد کے مؤقر اردو روزنامہ **"سیاست"** میں شائع ہوئے، پھر حیدرآباد ہی کے دوسرے مقبولِ عام روزنامہ **"ہمارا عوام"** میں پابندی کے ساتھ سال بھر سے مضامین شائع ہوتے رہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے (اللہ آگے بھی جاری رکھے آمین) بہت دنوں سے ان مضامین کو مرتب شکل میں جمع کرنے کی دلی خواہش تھی، اس کے ساتھ ہی کچھ موانع اس اہم کام کے لئے حائل بن رہے تھے، لیکن جب ہمارے بعض خیر خواہوں نے اس طرف توجہ دلائی، تو اس کے بعد احقر نے ان مضامین کو مرتب شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے (اللہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہونچائے آمین) اس امید کے ساتھ کہ یہ مجموعہ

محبت وشفقت کے ہاتھوں لیا جائے گا اور ذوق وشوق کی نگاہوں سے پڑھا جائے گا، پھر تحریری وفکری خوبیوں اور خامیوں پر مخلصانہ ومحبانہ نظر ڈالی جائے گی۔

بہت زیادہ احسان فراموشی اور ناشکری ہوگی، اگر اس موقع پر میں اپنے مخدومِ محترم، مشفقِ اعظم، محسنِ کبیر، رہنمائے قوم وملت، خادمِ دین وشریعت، صاحب فراست و بصیرت، عظیم نکتہ بیان، بلند پایہ مصنف، میدانِ تحریر وخطابت کے عظیم شہسوار، اردو زبان وقلم کے بے مثال ادیبِ دوراں **حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ العالی** ناظم وبانی جامعہ اسلامیہ **دار العلوم سبیل السلام** حیدرآباد ورکنِ تاسیسی **آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ** کے اکرامات واحسانات کا تذکرہ نہ کروں، جن کی زیرِ سرپرستی اللہ رب العزت نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں آپ کے سامنے یہ حقیر سا علمی کام پیش کرسکوں، اور جنہوں نے قدم بقدم، لحہ بلحہ اور ہر موڑ سے ہماری علمی، فکری، ذہنی اور جسمانی ہر طرح کی رہنمائی فرمائی ہے، اللہ رب العزت ان کے سایۂ عاطفت ورحمت کو پوری ملتِ اسلامیہ بالخصوص اس ناچیز کے لئے تادیر قائم ودائم اور باقی رکھے، اور اللہ تعالیٰ آپ سے اپنے دینِ مبین کی اور زیادہ سے زیادہ بہتر خدمات لے کر قبول فرمائے، آمین۔

میں اس موقع پر **حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی** مدظلہ العالی معتمدِ تعلیمات **دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو**، مقیم حال **مکہ مکرمہ** کا بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنے **کلمات عالیہ** سے اس کتاب کو زینت بخشی ہے، ان کے ساتھ ہی میں مخدومِ مکرم **حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی** ناظم **المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد** و جنرل سکریٹری **اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا** کا بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں، جنہوں نے اپنے قیمتی اوقات نکال کر اس ناچیز کے تحریری مسودہ کے لئے چند جملے ہی سہی مگر بہت ہی وقیع سطور ارقام فرمائے ہیں، ان کے علاوہ میں **مولانا مفتی تنظیم عالم قاسمی** زیدشرفہ استاذِ **دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد** کا بھی بے حد شکر گذار ہوں، جن کی رہنمائی میں یہ کتاب ترتیب دی جارہی ہے، اللہ ان حضرات کے سایۂ عاطفت کو ہم تمام مسلمانوں کے لئے تادیر قائم رکھے اور ان کے فیضان کو جاری رکھے آمین۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر میں **مولانا نوشاد علی** سبیلی سمستی پوری ایڈیٹر مذہبی صفحہ روزنامہ **"ہمارا عوام"** کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے بڑے اہتمام سے میرے مضامین کو شائع کئے، اور عزت افزائی فرما کر آگے کی طرف قدم بڑھانے کا جذبہ اور حوصلہ

عطا کیا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مجموعہ دراصل ان ہی کی ممنونِ نظر ہے، اس لئے کہ اگر ان کی طرف سے عزت افزائی نہ ہوتی تو شاید کہ اس مجموعہ کا وجود بھی نہ ہوتا، اس لئے ان کا دل کی گہرائیوں سے جس قدر بھی لفظی شکریہ ادا کروں وہ ان کی عملی نظر و کرم کا عشر عشیر بھی نہیں ہوسکتا ہے، بس ہم اس کے بدل کے طور پر دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ رب العزت ان کو اس کرم فرمائی کا دنیاوی اور اخروی دونوں طرح سے نعم البدل اور بہتر اجرِ جزیل عطا فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے، ان کے سیئات سے درگذر کا معاملہ فرمائے، اور ان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ عفوو درگذر کا معاملہ فرمائے، اور احقر کے لئے اس کتاب کو ذخیرۂ آخرت بنائے آمین **یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ**۔

محمد آفتاب عالم بانکوی
فاضل: دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

۱۰ر شعبان ۱۴۲۴ھ ۷ر اکتوبر ۲۰۰۳ء سہ شنبہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور ہماری زندگی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وقرار، اخلاق و کردار اور رہن سہن میں انسان کے لئے زندگی گذارنے کا اچھا نمونہ اور بہترین آئیڈیل ہے، اس کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کو تابناک اور منور بنایا جاسکتا ہے اور ہر طرح کی کامیابی وکامرانی حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں لوگوں کے لئے زندگی گذارنے کا کوئی نمونہ اور اصول نہ ہو۔ خواہ آپ کا بچپن ہو، عنفوانِ شباب کا دور ہو یا بڑھاپے کی عمر ہو غرض کہ آپ کی پوری زندگی تمام ہی انسانیت کے لئے مشعلِ راہ وشمع ہدایت ہے، جس کو اختیار کر کے انسان دنیوی فلاح و بہبود کیساتھ اپنی اخروی زندگی کو بھی بنا اور سنوار سکتے ہیں، قرآن پاک میں ہے کہ: تمہارے لئے اللہ کے رسول علیہ السلام کے اندر بہترین اسوہ اور نمونہ ہے۔

آج جب کہ پوری دنیا کے مسلمان عالمی سطح پر مظلوم ومبغوض اور دوسروں کے سہارے اور رحم و کرم پر جینے والے بن چکے ہیں اور چاروں طرف سے مسلسل ان پر طرح طرح کے ذہنی فکری اور جسمانی حملے کئے جارہے ہیں، تو ایسے پُرفتن دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اسی اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا اصول اور لائحہ عمل بنائیں جس کو اختیار کر کے عرب کی بدوقوم صحابہ کرام بن گئی تھی اور جس نے عرب کے ان بدسلیقہ، تہذیب وتمدن سے عاری اور حیوان صفت آدمیوں کو تہذیب وتمدن اور ثقافت کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا تھا اور ان کی طرزِ زندگی اور روزمرہ کے اعمال کو انسانی ہدایت کا معیار قرار دیا، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے متبعین کو نجات یافتہ قرار دیتا ہے اور ان کی معیاریت کو یوں بیان فرماتا ہے ''اگر وہ لوگ تم جیسا ایمان لے آئیں تو یقیناً وہ لوگ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ (البقرہ: ۱۳۷)

چنانچہ اس مضمون میں نبی اکرم علیہ السلام کے اسوہ حسنہ کے چند زرّین اور اعلیٰ نمونے کو قلمبند کیا جارہا ہے تاکہ ہم ان کو اختیار کر کے فلاح دارین حاصل کرسکیں۔

○ نبی اکرم ﷺ زندگی کے تمام امور میں حقوق العباد میں خصوصاً تمام ہی لوگوں سے اپنے معاملہ کو صاف رکھا کرتے تھے، آپ دوسروں سے کوئی بھی معاملہ کرتے تو اخلاقِ کریمانہ کے مظاہرہ کے ساتھ، قرض کی ادائیگی ہو، خرید وفروخت کا معاملہ ہو یا دیگر معاشرتی ماحول میں دوسرے اُمور، آپ ہمیشہ اس میں نرم پہلو کو اختیار کرتے، اگر کوئی آپ سے سخت کلامی یا ترش روئی سے پیش آتا تو آپ اس کے ساتھ نرمی اور عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے، آپ زمانۂ جاہلیت میں بھی حسنِ معاملہ کا خیال رکھتے تھے اور آپ تو تمام ہی لوگوں میں معاملہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ اچھے تھے، اسی وجہ سے کفارِ مکہ ہزار دشمنی کے باوجود آپ کو امین اور صادق کہہ کر پکار کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ دشمن بھی آپ کے پاس امانت رکھا کرتے تھے۔

○ عورتوں کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ'' تمہاری دنیاوی چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب میرے نزدیک عورت اور خوشبو ہے'' (نسائی: ۲ر۹۳) گویا کہ عورت سے اگر اچھے طریقے اور نرمی کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور ساتھ ہی وہ نیک سیرت بھی ہو تو وہ دنیا کی سب سے زیادہ محبوب نعمت ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے'' دنیا کی بہترین نعمت نیک عورت ہے'' (نسائی: ۲ر۷۱) آپ ؐ اس کے ساتھ بھی اچھائی کا برتاؤ کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اسی کا حکم دیتے تھے، چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے'' تم میں سب سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے اچھا ہو اور میں تم میں اپنی بیوی کے لئے سب سے زیادہ اچھا ہوں'' (ترمذی: ۲ر۲۲۸) آپ کی عادت شریفہ تھی کہ روزانہ عصر کے بعد اپنی تمام بیویوں کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کو دریافت کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ ہم میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دیتے تھے اور اکثر و بیشتر آپ ؐ ہم تمام عورتوں کے پاس آتے تھے۔ (ابو داؤد: ۱ر۲۹۰)

○ نبی ﷺ اپنے کام کو بذاتِ خود انجام دیتے تھے اور کبھی کبھار آپ دوسروں سے بھی کراتے تھے لیکن اکثر و بیشتر خود ہی کر لیا کرتے تھے، آپ نے اپنی چپل کی خود مرمت کی ہے، اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں میں پیوند بھی لگائی ہے، آپ کو دودھ دوہنے کی نوبت بھی آئی ہے اور آپ اپنا کپڑا خود ہی صاف کر لیا کرتے تھے اس کے علاوہ آپ دوسروں سے بھی کراتے تھے اور آپ اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے، مسجد کی تعمیر اور خندق کی کھدائی میں آپ بنفسِ نفیس شریک ہوئے ہیں اور بسا اوقات بھوک کی شدت کی وجہ سے آپ پیٹ پر پتھر بھی باندھے ہیں ایک مرتبہ آپ نے صحابہ کی شکایت کی وجہ سے پیٹ

سے کپڑا ہٹایا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، یہ ہے آپ کا طریقۂ تعلیم اور تربیت۔

○ زیب و زینت اور لباس و پوشاک کے سلسلے میں آپ نہایت سادگی پسند تھے، آپ کو لباس میں سب سے زیادہ پسند قمیص تھا اور آپ نے جبہ بھی استعمال فرمایا ہے، قمیص کے ساتھ آپ لنگی زیب تن کرتے تھے اور آپ نے شلوار بھی پہنا ہے (زادالمعاد: ۱۳۹/۱) آپ کو سفید رنگ سب سے زیادہ پسند تھا، آپ کا ارشاد ہے یہ سفید کپڑا تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہے (ترمذی: ۱۹۳/۱) آپ نے صرف ٹوپی، صرف عمامہ یا ٹوپی کو عمامہ کے ساتھ استعمال فرمایا ہے، آپ نے موزہ، تاسومہ نامی چپل اور انگوٹھی پہنا ہے، لیکن آپ سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرماتے تھے اور آپ کبھی کبھار ننگے پاؤں بھی چلے ہیں۔

○ جب راستہ چلتے تو آپ تکبرانہ چال نہیں چلتے، جھک کر چلتے گویا کہ آپ نشیبی زمین پر اتر رہے ہوں اور آپ تیز چال چلتے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تیز چلتے کسی کو نہیں دیکھا، گویا کہ زمین آپ کے لئے سمیٹ دی گئی ہو (شمائل ترمذی: ۸) آپ کی نگاہ آسمان کی طرف بہت کم ہوتی اور اکثر اپنی نگاہ زمین کی طرف رکھا کرتے تھے حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ جب آپ چلتے تو ٹھہر ٹھہر کر چلتے ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ جب آپ چلتے تو پاؤں کو اٹھا اٹھا کر چلتے جس طرح کہ عزم و حوصلہ مند اور شجاعت و بہادر آدمی چلا کرتے ہیں اور آپ کا یہ چلنا درمیانہ چال ہوتا جو اعضائے بدن کے لئے زیادہ آرام دہ ہوتا اور آپ سست اور کاہل آدمی کی طرح نہیں چلتے، جب آپ اپنے اصحاب کے ساتھ چلتے تو ان کو آگے رکھتے اور خود پیچھے رہتے اور آپ کو راستہ میں جو شخص ملتا تو آپ اس کو پہلے ہی سلام کرتے۔

○ بال کے سلسلے میں نبی ﷺ کا اسوہ یہ تھا کہ آپ بال کان کی لو تک رکھتے، جب بال اس سے تجاوز کرتا تو کان کی لو اور مونڈھے کے درمیان ہوتا اور جب اور زیادہ بڑھتا تو آپ کا بال مونڈھے تک ہوتا تھا، لیکن آپ اس سے زیادہ نہیں چھوڑتے تھے اور آپ بال برابر رکھتے تھے، نہ تھوڑا کٹاتے اور نہ تھوڑا بال بڑا رکھتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ سر میں تیل بھی لگاتے تھے، آپ کنگھی کرنے کو پسند فرماتے تھے، کبھی تو خود ہی کرتے تھے اور کبھی آپ کی بیوی کنگھی کر دیا کرتی تھی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "آپ کے سر میں میں کنگھی کر دیا کرتی تھی" (بخاری: ۴۳/۱)۔

○ حفظان صحت جو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، اس کا بھی نبی اکرم ﷺ نے خاص لحاظ فرمایا ہے اور ہر وہ چیز جو انسانی بدن اور صحت کے لئے مضر ہو اس سے منع کیا ہے، شریعت اسلامیہ میں جتنی بھی چیزیں

حرام ہیں وہ اسی اصول کے تحت ہیں کہ ان تمام چیزوں میں صحت کے لئے مضرت اور نقصان کا پہلو ہے، اسی حفظانِ صحت کی حفاظت کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ورزش وغیرہ کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ صحت قابلِ اطمینان رہے اور اس کو اللہ کے نبی ﷺ نے بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے، ارشاد ہے ''دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سارے لوگ دھوکہ کھائے ہوئے ہیں ایک صحت اور دوسری فارغ البالی'' (سنن دارمی: ۲ر۳۸۵)

○ نبی اکرم ﷺ کو خوشبو بہت زیادہ پسند تھی اور اس کو آپ نے دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے شمار کیا ہے آپ کا ارشاد ہے ''تمہاری دنیاوی چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب میرے نزدیک عورت اور خوشبو ہے'' آپ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص کو خوشبو پیش کیا جائے تو چاہئے کہ وہ اسے واپس نہ کرے'' (نسائی: ۲ر۲۹۳) مسند بزار میں آپ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور صاف ستھرا ہے صفائی ستھرائی کو پسند کرتا ہے...... لہٰذا اپنے گھروں اور صحنوں کو صاف ستھرا رکھا کرو، یہود کی مثل نہ بنو کہ وہ لوگ گھروں میں گندگیوں کو جمع کرتے ہیں۔ خوشبو فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے اور ہر متنفس مزاج اس کو پسند کرتا ہے اور اس میں ایک ایسی خاصیت ہے جس کو فرشتے پسند کرتے ہیں اور اس سے شیطان نفرت کرتا ہے، اس سے اسلام کی نفاست و نظافت کا پتہ چلتا ہے کہ یہ مذہب کتنا تنفس اور نظافت پسند مذہب ہے۔

○ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ چھینک کو پسند کرتا ہے چنانچہ جب کسی کو چھینک آئے تو وہ الحمد للّٰہ کہے اور اس کے جواب میں سننے والے مسلمان پر یرحمك اللّٰہ کہنا واجب ہے (بخاری: ۲ر۹۱۹) اس کے بعد چھینکنے والا شخص دوسرے شخص کو یھدیکم اللّٰہ و یصلح بالکم کہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں چھینک کے وقت الحمد اللّٰہ علی کل حال کہنے کی تعلیم دی ہے۔

○ نبی اکرم ﷺ تمام بندگان خدا میں سب سے زیادہ اچھی بات کرنے والے تھے، آپس میں بات کرنے کے اعتبار سے شیریں زبان تھے، آپ الفاظ کی ادائیگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ تیز تھے، آپ کی بات جامع اور مختصر ہوا کرتی تھی، آپ جب بات کرتے تو ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف بولتے کہ یاد کرنے والے دوہرا لیں، ایسی بات نہیں کرتے جو یاد نہ کی جا سکے، آپ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے اور نہ ہی بغیر ضرورت کے بات کرتے، آپ کی بات حذف وزوائد سے پاک ہوتی تھی،

○ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب اور متعلقین میں جو کوئی بیمار ہوتا تو آپ اس کی عیادت کے لئے جاتے خواہ وہ مشرک یہودی اور منافق ہی کیوں نہ ہو، آپ نے اپنے ایک مشرک چچا کی عیادت فرمائی ہے، اسی طرح سے آپ نے ایک یہودی بچہ کی عیادت فرمائی ہے، جو آپ کی خدمت کیا کرتے تھے، تو اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا، آپ نے مریض کی عیادت حقِ مسلم قرار دیا ہے، آپ جب عیادت کے لئے جاتے تو مریض سے قریب ہوتے، اس کے سر کے پاس بیٹھتے، اس کی حالت دریافت فرماتے، مریض کے بدن پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرتے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے شفاء کی دعا فرماتے (بخاری: ۲ر ۸۵۵) پھر پوچھتے تم اپنے آپ کو کیسے محسوس کر رہے ہو؟ اگر مریض کسی چیز کی خواہش کا اظہار کرتے اور وہ اس کے لئے مضر نہ ہوتا تو اس کو پورا کرنے کا حکم دیتے، آپ کا ارشاد ہے ''مریض کی خواہش معلوم کرو پھر اس کو پورا کرو''

○ نبی اکرم ﷺ اپنے گھر میں اچانک داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پہلے گھر والے کو معلوم کرا دیتے، اس کے بعد گھر آتے اور جب آپ آتے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرتے ان کی حالت دریافت کرتے اور مسواک کرتے تاکہ منہ کی بدبو ختم ہو جائے جو باہر میں پیدا ہوگئی تھی اور گھر والا اس سے نفرت نہ کرے، جب آپ رات میں آتے تو ان کو اس طرح سلام کرتے کہ بیدار آدمی اس کو سن لیتے اور سونے والے کی نیند میں کوئی خلل نہ ہوتا، آپ نے حضرت انسؓ سے فرمایا ''جب تم اپنے اہل کے پاس آؤ تو تم سلام کرو'' (ترمذی: ۲ر۹۹) آپ نے دوسرے موقع پر فرمایا ''وہ شخص جو اپنے گھر سلام کر کے داخل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ پر ضمان والا ہوتا ہے'' (ابو داؤد: ۷ر۳۳۷) اور اس کو کسی طرح کی مصیبت اور پریشانی لاحق نہیں ہوتی ہے۔

○ حدیث پاک میں آیا ہے کہ سلام کو آپس میں پھیلاؤ تو تم آپس میں محبت کرنے لگو گے (مسلم: ار۵۴) سلام آپسی محبت میں اضافہ، بغض وعناد اور دشمنی کو فرو کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اس سے انسانی دل پسیجتا ہے، سلام کرنا سنت ہے۔

سلام سے مقصود انسان کے اندر عجز وانکساری پیدا کرنا ہے اور غرور وتکبر اور انانیت کو ختم کرنا ہے اسی لئے سلام کا عادی شخص کسی کے سامنے تکبر اور بڑائی سے پیش نہیں آتا ہے اور وہ ہر شخص سے عجز و انکساری کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔

○ انسان کے اندر غضب وغصہ کا آنا فطرت کے مطابق ہے لیکن غصہ کو پی لینا اور برداشت کر لینا ہی عقلمندی اور قابلِ قدر بات ہے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ''طاقتور وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے

بلکہ طاقتور تو وہ ہے جو غصہ کو پی لے (بخاری: ۲/۹۰۳) غصہ سے بچنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ غصہ کی آگ بجھانے کے لئے وضو کیا جائے تو اس سے غصہ ختم ہو جائے گا یا پھر ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جائے اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، اگر لیٹا ہو تو کھڑا ہو جائے غرض کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے سے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے سے غصہ کافور ہو جاتا ہے۔

○ نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں سے ایک بے کار بے معنی اور فضول باتوں کا چھوڑنا ہے اور اس میں وہ تمام شکلیں شامل ہیں جن کا تعلق ضیاع اوقات بے مقصد کاموں اور بے معنی ومطلب باتوں سے ہو، جیسے دیکھنا، بات کرنا، سننا، آپس میں ملنا جلنا، کھانا، پینا اور سونا یہ سب ضرورت کی حد تک تو جائز اور مباح ہیں اور انسانی ضروریات میں داخل ہیں، لیکن حدود سے تجاوز کرتے ہوئے بے مقصد اور بغیر ضرورت کے یہ سب کام کرنا فضول ہے اور اس کا ترک لازم ہے، اس لئے کہ یہ تمام چیزیں مصائب و آلام اور پریشانیوں کو دعوت دینے والی ہیں اور ان سے دل میں ذہنی فکر و پریشانی اور الجھن پیدا ہوتی ہے نبی اکرم ﷺ نے ترک فضول کو حسنِ اسلام قرار دیا ہے، آپ کا ارشاد گرامی ہے ''لوگوں کے اسلام کی اچھائی میں سے ان چیزوں کا ترک کرنا ہے جو کوئی مقصد اور معنی نہ رکھتا ہو'' (ترمذی: ۲/۸۵)۔

یہ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ میں سے چند نمونے ہیں جو ذکر کئے گئے ہیں، اُمید ہے کہ قارئین اس مضمون کو پڑھ کر اپنی زندگی میں نمایاں تبدیلی لانے کی فکر کریں گے اور ساتھ ہی وہ راقم الحروف کے لئے بھی دعاء کریں گے کہ اللہ تعالیٰ راقم کے اندر ان تمام اوصاف کو جمع فرما دے اور اس کی زندگی سنت کی روشنی میں ڈھل جائے۔

(۱۲/ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد اور ورثائے انبیاء کی ذمہ داریاں

دین اسلام ایک نظامِ کامل ہے، اس کا ایک آئین اور دستور ہے اور اس کے دو شعبے ہیں، ایک خارجی اور دوسرا داخلی، پھر خارجی شعبہ کے دو جزء ہیں، ۱۔ دعوت وتبلیغ ۲۔ جہاد۔ اور داخلی شعبہ کے چار اجزاء ہیں، ۱۔ تلاوتِ قرآن ۲۔ تعلیم قرآن ۳۔ اسرار دین کی وضاحت ۴۔ اور تزکیہ نفوس یعنی تصوف اور یہ سارے اقسام قرآن کریم سے ثابت ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت جب تک دنیا میں موجود تھی، تو یہ تمام ذمہ داریاں آپ پر تھیں، لیکن جب آپ اس دنیا سے کوچ فرما گئے، تو اب یہ ذمہ داریاں علماء امت پر ڈالی گئی ہیں، اس لئے کہ آپ سے قبل تو نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ جاری تھا اور اب تو نبیوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور اب کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے، چنانچہ انہی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''کہ علماء کرام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ورثاء ہیں'' (مسند احمد: ۱۹۷/۵)

الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے کے یہی چھ مذکورہ مقاصد تھے اور یہی آپ کی زندگی کا مشن تھا اور آپ نے اپنی پوری زندگی کو انہی مقاصد کے لئے وقف کر دیا تھا، چنانچہ علماء کرام جو وارث ہوں گے تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی مقاصد اور آپ کے اسی مشن کے وارث ہوں گے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد وتعلیمات کے خارجی اور داخلی دونوں امور پر عمل آوری ضروری ہے، ذیل کی تحریروں میں ان کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

دعوت دین الٰہی

جب کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے، یا کوئی مسلمان (بلوغ یا جنون سے افاقہ کے بعد) شریعت

کا مکلف ہوتا ہے، تو اولاً اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دعوت دین کا فریضہ انجام دے اور ہر طریقہ کار اختیار کر کے اس کی تبلیغ واشاعت کرے، اللہ تعالیٰ نے اپنے لاڈلے رسول ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا ''اے رسول آپ اپنے اوپر اپنے پروردگار کی جانب سے نازل شدہ احکام کی تبلیغ کیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو یاد رکھئے کہ آپ نے اپنی رسالت کی تبلیغ نہیں کی (المائدہ:٦٧) آپ ذرہ غور فرمایئے کہ اس کا مخاطب کون ہے؟ چنانچہ اس کا مخاطب وہی تو ہیں، جن کی خاطر دنیا و مافیھا پیدا کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ سے مخاطب ہے کہ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے اپنی رسالت کی ذمہ داری ادا ہی نہیں کی۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے تمام امت محمدیہ کے لئے دعوت دین کی ادائیگی فرض کفایہ ہے، بلکہ دوسری جگہ تو دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری براہ راست امت محمدیہ کے سر سونپی گئی ہے، چنانچہ ال عمران کی آیت ۱۵۴ میں صراحت کے ساتھ امت کو مخاطب کیا گیا ہے، وہ بھی امر کے صیغہ کے ذریعہ، جس کی بناء پر فقہاء عظامؒ نے دعوت کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اگر پوری دنیا کے مسلمانوں میں سے کوئی بھی دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ادا نہ کرے تو پوری دنیا کے تمام مسلمان گنہگار اور عتابِ الٰہی کے سزاوار ہوں گے۔

الجہاد فی سبیل اللہ

جہاد کا معنی لغت کے اندر ''سعی ومحنت اور جہد و کاوش'' کے ہے جو دین کے ہر کام پر صادق آتا ہے، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے لائن سے ہو، تعلیم وتعلم کے قبیل سے ہو، یا جہاد کے راستے سے اور یا تو کسی بھی طریقے سے ہو، غرض کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور اس کے دین کو بلند کرنے کے لئے کسی بھی طریقے سے جہد مسلسل اور عمل پیہم کرنا جہاد میں شامل ہے، لیکن شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں جہاد کہا جاتا ہے دشمنانانِ اسلام سے اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کو اور یہاں جہاد سے یہی جہاد مراد ہے اور دعوت وتبلیغ کے لئے جہاد بہت اہمیت کی حامل ہے، اس لئے کہ جب آپ دعوت کا مشن شروع کریں گے تو آپ کو عوام کا سامنا ہوگا، نیز ملکی پیمانے پر حکومت آپ کو کچلنے کی کوشش کرے گی، تو آپ کے لئے اس کا دفاع کرنا لازمی ہے، جس سے دفاعی جہاد ثابت ہوتا ہے اور جب آپ اللہ کی سرزمین پر اسلامی سلطنت اور احکام الٰہی کو نافذ کرنا چاہیں گے، تو بغیر اقدامی جہاد کئے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے،

جس سے اقدامی جہاد ثابت ہوتا ہے، نیز جہاد کا وجوب قرآن کی بے شمار آیتوں مثلاً سورہ انفال کی آیت ''وقاتلوھم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین کله لله '' سے ثابت ہوتا ہے اور آلات حرب و ضرب کی تیاری کا وجوب سورہ انفال کی آیت ۶۰ ''واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ الخ '' سے ثابت ہوتا ہے، جس کی بناء پر خلیفۂ مسلمین پر آلات حرب وضرب کا تیار کرنا واجب ہے۔

جہاد کے مقاصد

جہاد کا مقصد یہ ہے کہ سلطنتِ اسلامی قائم کر کے امن و امان بحال کیا جائے، کمزوروں کو ان کے حقوق دیئے جائیں اور ظالموں کو ان کے ظلم کا بدلہ دیا جائے اور عالمی پیمانے پر دعوت دین اور تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا جائے، چنانچہ علامہ قرطبیؒ سورہ نساء کی آیت ۷۵ ''و ما لکم لا تقاتلون فی سبیل الله '' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''مذکورہ آیت سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنا ہے اور یہ آیت ان کمزور و بے بس مسلمانوں کی رہائی کو بھی شامل ہے، جو کافروں اور مشرکوں کے قبضے میں ہیں اور وہ لوگ ان اہلِ ایمان کو برے برے عذاب اور بڑے بڑے فتنوں میں مبتلا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمہ کی سر بلندی، (باطل مذہبوں کی سرکوبی) اپنے دین کے اظہار اور اپنے کمزور مسلمان بندوں کو بچانے کے لئے جہاد فرض کیا...... اور مسلمان قیدیوں کو رہاء کرانا جماعتِ مسلمین پر واجب ہے، خواہ قتال کے ذریعہ ہو یا فدیہ کی ادائیگی کے ذریعہ'' (الجھاد فی سبیل الله :۲/۱۶۲ بحوالہ جامع احکام القرآن ۵/۲۷۹)

تلاوت و تعلیم قرآن

نبی اکرم ﷺ پر جب نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ مکمل تین سال تک خفیہ طریقے پر تلاوت قرآن کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن جب آپ کو علانیہ تلاوت کا حکم ملا تو ۳ھ نبوی کے بعد آپ علانیہ تلاوت کرنے لگے اور یہ سلسلہ آپ نے اپنے آخری لمحہ تک جاری رکھا اور دوسری جانب آپ تعلیمِ قرآن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لئے آپ نے مکی زندگی میں دارِ ارقم کو خاص کیا اور آپ نے وہیں سے باضابطہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے بعد جب آپ مدینہ کی جانب ہجرت فرما گئے تو

باضابطہ وہاں تعلیم کے لئے مسجد نبوی کے پاس ایک چبوترہ بنایا اور اسی چبوترہ کے طلباء کتب سیرت میں اہلِ صفہ کے نام سے معروف ومشہور ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ ان دونوں فریضہ کو انجام دینے لگے اور ان کے پاس دور دراز شہروں سے طلبۂ عزیز حصول علم کے لئے آتے تھے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں مرد وعورت دونوں برابر کے شریک تھے،

حضور اکرم ﷺ کی دینی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھنے ہی کے مقصد سے سلطان محمود غزنویؒ نے چوتھی صدی ہجری کے بعد افغانستان میں مدرسہ کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی، اس کے بعد ہر جگہ مدارس کا جال تیزی سے پھیلنے لگا اور ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری میں ملتان کے حکمران ناصرالدین نے ملتان میں مدرسہ کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی، اس کے بعد ہندوستان میں بھی مدارس کا سلسلہ مشرق و مغرب سے شمال وجنوب تک پھیل گیا، اس کے بعد اہلِ مدارس باضابطہ اور بحسن وخوبی تعلیم کا فریضہ انجام دینے لگے اور دوسری طرف وہ لوگوں کے سامنے جلسے، پروگرام اور تقاریر وغیرہ کی شکل میں تلاوت کرنے لگے اور اس کے معانی ومفاہم سمجھانے لگے۔

اسرار دین

امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں حکمت کے تحت لکھتے ہیں ''کہ حکمت کا مطلب سنت ہے، جس کو بیان کیا ہے حسن بصری، قتادہ، مقاتل بن حبان اور ابو مالک وغیرہ نے اور کہا گیا ہے کہ حکمت نام ہے دین کے اندر فہم کا اور ان دونوں قولوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے'' (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیرؒ ۱/۱۷۵) اس لئے کہ اس سے مراد سنت نبوی ﷺ اور دین میں فہم دونوں ہوسکتا ہے، کیوں کہ دین میں سمجھ، بوجھ اور فقاہت بغیر سنت کے پیدا نہیں ہوسکتی ہے اور تفسیر منیر (۳/۲۲۹) میں ہے ''کہ حکمت نام ہے علم نافع کا اور علم نافع انسان کے اندر وہ بصیرت ہے جو پیدا ہو فقہی احکام اور اسرار شریعت سے اور علامہ بیضاویؒ نے اپنی تفسیر (۱/۱۰۷) میں لکھا ہے کہ '' حکمت وہ ہے جس کے ذریعے انسان کے نفوس معارف واحکام سے مکمل ہو جائے'' اور اسی کی تائید تفسیر منیر (۱/۳۱۲) کی اس عبارت سے ہوتی ہے کہ '' حکمت دینی احکام کے اسرار اور شریعت کے مقاصد کی معرفت ہے''۔

بعض دینی احکام کی حکمت تو خود قرآن حکیم نے بیان کیا ہے، جیسا کہ قصاص کی حکمت قرآن نے ''ولکم فی القصاص حیاۃ'' بیان کیا ہے اور بعض احکام کی حکمت تو خود نبی ﷺ نے بیان فرمایا

ہے، جیسا کہ آپ نے فرمایا ''جو شخص نان ونفقہ کی طاقت رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ نکاح کرے'' اور اس کی حکمت بیان کیا ''اس لئے کہ نکاح نگاہ کی حفاظت اور شرمگاہ کے پاک رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے'' اور فرمایا ''اور جو شخص طاقت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ روزہ کو اپنے اوپر لازم کرلے'' اور اس کی حکمت یوں بیان فرمایا ''اس لئے کہ روزہ خواہشات نفس کے لئے ڈھال ہے'' (بخاری: ۲/۷۵۸، مسلم: ۱/۴۴۸)
نبی اکرم ﷺ کے بعد بھی علماء امت اور صلحاء قوم اس کام میں مشغول رہے چنانچہ بیسویں صدی میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ اس کام کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے ہیں اور اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

تزکیۂ نفوس

جناب نبی کریم ﷺ کا آخری مشن ''تزکیہ نفس'' تھا آپ اپنی زندگی کے آخری حصے میں اس کی طرف مائل اور متوجہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آپ کو بذریعہ وحی معلوم کر دیا تھا کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے میں لوگ جوق در جوق داخل اسلام ہوں گے اور آپ کو اس وقت مومنین کے واسطے استغفار کرنا ہوگا (النصر: ۲،۳) تو لازماً اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جب لوگوں کے وفود بکثرت آپ کے پاس آیا کریں گے اور اسلام قبول کریں گے تو اس وقت آپ کو کہیں دعوت وتبلیغ کے لئے جانا نہیں ہوگا بلکہ آپ انہیں نئے مسلمانوں کے نفوس کا تزکیہ کیا کریں گے۔

''تزکیہ نفوس کے مشہور اور مرکزی سلسلے اگرچہ ہندوستان سے باہر پیدا ہوئے لیکن ان کو سب سے زیادہ فروغ اور مقبولیت ہندوستان ہی میں حاصل ہوئی ان سلاسل تزکیہ نفس میں بعض ایسی ہندوستانی شاخیں پیدا ہوئیں جنہوں نے خود مستقل سلاسل کی اور جداگانہ طریق سلوک وتربیت کی شکل اختیار کر لی...... گیارہویں صدی سے تقریباً ہندوستان ہی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا علمبردار نظر آتا ہے...... تیرہویں صدی کے سلسلہ مجددیہ کے شیخ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ میں روم، شام، بغداد، مصر، چین، حبش، سمرقند اور بخارا تک کے لوگ استفادہ کے لئے آتے تھے...... اس وقت پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی کی بدولت اصلاح باطن کی یہ شمع روشن ہے۔'' (تزکیہ واحسان: ۹۳،۹۴)

کلام آخر اور امامت و قیادت

یہ تو نبی کریم ﷺ کے مقاصد کی اجمالی تفصیل تھی اور انہی مقاصد و مشن کے علماء کرام وارث ہیں، لہٰذا وقت کی نزاکت اور حالات کے رخ کو دیکھتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا چاہیے، تب جا کر دینِ اسلام ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے اور ان دونوں آیات قرآنی ''(دشمانان اسلام) اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھانا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، اگر چہ کافر لوگ ناپسند کریں، وہ ذات وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور برحق دین کے ساتھ، تاکہ اس کو تمام (باطل) دینوں پر غالب کر دے اگر چہ مشرکوں کو یہ بات ناپسند معلوم ہو'' (الصف: ۸،۹) کو صداقت کا علمی جامہ پہنایا جاسکتا ہے اور امت محمد یہ اس آیت قرآنی ''اور تم سب کمزور نہ ہو جاؤ اور نہ تم سب غمگین ہو اور تم سب (سرزمین) پر سر بلند رہو گے اگر تم اہلِ ایمان ہو (آل عمران: ۱۳۹) کی بشارت وخوشخبری کا مستحق بن کر دنیا کی امامت و قیادت سنبھال سکتا ہے اور تب ہی جا کر وسط امت بن کر مشرق و مغرب میں امن وامان قائم کر کے دنیا کے گمراہ انسانوں کو راہِ راست اور ہدایت کی طرف لاسکتا ہے اور اس کے بعد ہی کفر وشرک اور بدعات وخرافات کی کمر توڑی جاسکتی ہے۔

(۲۷ رربیع الاول ۱۴۲۴ھ)

جانوروں پر رحم وکرم اسلامی شریعت میں

مذہب اسلام دین حنیف کا نام ہے اور حنیف کا مطلب ہے تمام باطل اور بیہودہ باتوں سے بچتے ہوئے اعتدال کی راہ پر چلنا اور درجہ توازن پر اپنے آپ کو قائم رکھنا، نہ حد اعتدال سے تجاوز کرنا اور نہ ہی اس میں تقصیر سے کام لینا، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "خیر الامور اوسطھا" اسی لئے دین کے تمام ہی ارکان وافعال اس پیمانہ پر پورے اترتے ہیں اور اسکا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جو حد اعتدال سے متجاوز ہو، جب کہ مذہب اسلام کے علاوہ جتنی بھی دوسری قومیں ہیں، وہ یا تو افراط کا شکار ہیں یا پھر وہ تفریط میں مبتلا ہیں، لیکن دین اسلام ان سب سے بالکل ہی مختلف ہے اور اس کا ہر انداز ہی جداگانہ ہے۔

لیکن دین اسلام کے حد اعتدال پر قائم ہونے کے باوجود اس کے ارکان و افعال پر شرپسند عناصر کی جانب سے اعتراضات کئے جاتے ہیں، کبھی طواف کعبہ اور زیارت روضۂ اقدس کا سوال اٹھایا جاتا ہے، تو کبھی اس کے دیگر ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کو ضیاع وقت اور خلاف عقل قرار دیا جاتا ہے، اسی طرح سے ان کا ایک اہم اعتراض قربانی پر ہوتا ہے کہ اس میں جانوروں پر ظلم کیا جاتا ہے اور یہ لوگ گوشت خوری کے واسطے جانور کی قربانی کو عبادت کا نام دیتے ہیں، شرپسند عناصر اعتراضات پر ہی بس نہیں کرتے ہیں، بلکہ اس کو بنیاد بنا کر سماج و معاشرے میں شر وفساد برپا کر کے ہندوستان کی قومی آہنگی کو ختم کرنے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

جب کہ قربانی صرف مذہب اسلام اور مسلمانوں ہی میں رائج نہیں ہے بلکہ یہ تو قدیم زمانے سے مروج ہے، ہندو مذہب میں بھی "بلدان" کا تصور ہے، جس کے بارے میں آپ انہی سے دریافت کریں کہ یہ "بلدان" کیا ہے؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ یہ بتوں اور بھگوان کے نام پر جانوروں کا کاٹنا ہے اور اسی کو وہ سب بلدان کہتے ہیں، جب ان کے ہاں بھی اس بلدان (قربانی) کا تصور ہے تو پھر ان

شر پسند عناصر کی جانب سے مسلمانوں کے اوپر الزام اور بہتان تراشی کہاں تک صحیح ہے؟ وہ خود ہی واضح ہے۔

مذہب اسلام میں قربانی سے دراصل دل کا جذبۂ فدائیت اور اخلاص وللہیت مقصود ہے اور بندہ اسی کے اظہار کے لئے جانور کی قربانی کرتا ہے اور وہ یہ عزم مصمم کرتا ہے کہ ابھی تو اللہ رب العزت کے لئے جانور کو قربان کر رہا ہوں، لیکن جب وقت آئے گا تو میں اپنی جان کو بھی راہ خدا میں قربان کرنے سے کوئی جھجھک محسوس نہیں کروں گا اور دریغ سے کام نہیں لوں گا اور یہ جانور کی قربانی درحقیقت اپنی جان کی قربانی ہے۔

اگر آپ تاریخ وحقائق سے واقف ہوں گے تو آپ کو اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ مسلمانوں کے بالمقابل دیگر قومیں زیادہ اور وافر مقدار میں گوشت کھاتی ہیں۔ (تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے دیکھئے مولانا پاریکھ کی کتاب ''گائے کا قاتل کون اور الزام کس پر؟'' جو ہندی، اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔)

ہندو تاریخ کے مطابق ''رام'' کو جب آندھرا کے علاقہ سے ان کے معتقدین وداع کر رہے تھے تو ان کو تحفہ میں گائے کا گوشت پیش کیا تھا، عجیب معاملہ ہے مقتدا تو اس کے شوقین تھے لیکن معتقدین اسی کی وجہ سے دوسروں کو بدنام کرتے ہیں اور ان پر گوشت خوری کا الزام لگاتے ہیں۔

جانوروں کی قربانی اور ان کا گوشت کھانا یہ ان کے اوپر ظلم کے مترادف نہیں ہے اور نہ ہی ان کے مقصد تخلیق کے مغائر ہے، بلکہ یہ ان کے مقصد پیدائش کے عین مطابق ہے، آپ غور کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا صرف ان سے گھر کی زینت مقصود ہے؟ کیا صرف انسان ان کے پیچھے حیران و پریشان ہوگا؟ یا صرف ان کے لئے چارہ پانی کا انتظام کرے گا اور اس سے فائدہ حاصل نہیں کرے گا؟ تو یہ تمام باتیں بالکل باطل ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ خود ان کی وجہ تخلیق بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے ''چوپائے کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے، اس میں جاڑے کا سامان ہے اور بھی کئی فائدے ہیں اور اس سے تم کھاتے ہو'' (النحل: ۵)

اس آیت سے گوشت خوری کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے جس کے لئے ذبح کرنا لازمی ہے جس کے بغیر اس کا کھانا ممکن ہی نہیں، جب اللہ رب العزت احسان جتلاتے ہوئے گوشت خوری کو بطور مثال پیش کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم اس سے کھاتے ہو تو پھر مخلوق کو کیا اعتراض کا حق بنتا ہے کہ وہ جانور کی قربانی پر اعتراض کرے، اس کے علاوہ آپ خود غور وفکر سے کام لیں تو یہی سمجھ میں آئیگا کہ وہ انسان کی

غذا کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان اس سے فائدہ حاصل کرے اور قرآنی آیتوں کے مطابق فائدہ حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں، اس سے سواری کا کام لے، بوجھ برداری کا کام لے وغیرہ۔

ان آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پیدائش کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے خواہ اس کے طریقے مختلف کیوں نہ ہوں اور ان طریقوں میں گوشت خوری بھی ہے جس کو کہ صراحت کے ساتھ "تَاْكُلُوْنَ" کے لفظ سے بیان فرمایا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جانوروں کی قربانی ان کے اوپر ظلم و زیادتی نہیں ہے، اگر کوئی گوشت خوری پر اعتراض کرے تو سب سے پہلے اس کو چاہئے کہ وہ اس سے کلی طور پر فائدہ اٹھانے سے باز آجائے نہ اس سے سواری کا کام لے، نہ اس کے دودھ کو استعمال میں لائے اور نہ ہی اس سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرے۔

جانوروں کی قربانی پر اعتراض کرنے والوں سے میرا سوال ہے کہ کیا ان کی نظر میں جانوروں کا مرتبہ انسانوں سے زیادہ ہے؟ اگر واقعی کسی کے اندر رحم و کرم کا جذبہ ہے تو وہ جانوروں کو بنیاد بنا کر ہرگز انسانوں کے قتل و خون کو جائز قرار نہیں دے سکتا، لیکن یہی وہ شرپسند عناصر ہیں کہ جنہیں انسانیت سے کوئی سروکار نہیں، یہی لوگ اس طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر قتل و خون اور غارت گری کو اپنا شیوہ بناتے ہیں جس کا ثبوت انہوں نے حال ہی میں گجرات کے اندر دیا ہے۔

کیا یہی انسانوں کی قدر و منزلت کا تقاضہ ہے؟ یا وہ انسان ہی نہیں تھے جن کو گجرات میں قتل کیا گیا، ایک طرف جانوروں پر تو رحم و کرم کیا جائے لیکن دوسری طرف انسانی خونوں کو جانوروں کا بھی درجہ نہ دیا جائے اور ان کا خون بہایا جائے، کیا یہی عدل و انصاف کا تقاضہ ہے؟ یہ گجرات ہی میں نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی جانوروں کے متعلق آواز اٹھائی جاتی ہے وہاں وہاں مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا گیا ہے اور کیا جارہا ہے۔

اس کے برخلاف آپ مذہب اسلام کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ مذہب تو انسان اور بڑا جانور تو کجا ذرہ میں چیونٹی پر بھی ظلم و زیادتی کا قائل نہیں ہے، اس کے نزدیک تمام جانداروں کی یکساں قیمت ہے اس لئے کہ مذہب اسلام میں جانوروں پر بھی رحم و کرم کی تعلیم و ترغیب دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جانوروں کو ناخن، دانت اور کند چھری سے ذبح کرنے سے منع فرمایا (بخاری: جلد۲، صفحہ ۸۲۷) کہ اس سے ان کی تکلیف میں زیادتی ہوگی، آپ ﷺ نے محض شک کی بنیاد پر بل (سوراخ) میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی جانور ہو اور اس کو تکلیف

پہنچے اور وہ انتقاماً ڈنس لے اور چھوٹے پرندوں کو شکار کرنے سے منع فرمایا حتیٰ کہ نبی ﷺ نے گھر میں رہنے والے سانپ کو مارنے سے منع فرمایا، ابولبابہ بدری نقل کرتے ہیں ''ان النبی ﷺ نهى عن قتل جنان البيوت '' (بخاری: جلد ۲ صفحہ ۲۷ ۵)، جب شریعت اسلامیہ ان معمولی جانداروں پر ظلم و جور کا قائل نہیں ہے تو وہ بڑے جانوروں اور انسانوں پر ظلم کو کب برداشت کر سکتی ہے؟ یہ محض حقیقت سے چشم پوشی اور اسلام دشمنی کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ وہ اسلام کو ہدف تنقید بنانا چاہتے ہیں۔

مذہب اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ وہ جرائم و حادثات کے اسباب کو بھی اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔

(۱۰/ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ)

*****

تحفظ آب کا مسئلہ اور اسلامی تعلیمات

موجودہ حالات میں بارش نہ ہونے اور پانی کی قلت کی وجہ سے ''تحفظ آب'' کا مسئلہ بہت ہی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔''تحفظ آب'' کی شدید ضرورت اور اہمت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے مختلف اقدامات کیئے جارہے ہیں اور پانی کے بیجا استعمال سے باز رہنے کے لئے عوام کو اخبارات کے ذریعے مشورے بھی دیئے جارہے ہیں تاکہ پانی کی قلت کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔لیکن قربان جائیے رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر کہ انہوں نے آج سے ۱۴۰۰ سو سال پہلے ہی ''تحفظ آب'' کا ایسا سبق دیا جس کو اپنا کر آج بھی پانی کی قلت سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے اور ''تحفظ آب'' کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

شریعت اسلامیہ میں اللہ کی ہر ایک نعمت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کسی بھی نعمت کی فراوانی کے باوجود اس میں اسراف اور ضرورت سے زیادہ خرچ جائز نہیں ہے اور نہ ہی تبذیر بلکہ اس کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے۔اگرچیکہ کسی کے پاس دولت کی بہتات ہی کیوں نہ ہو اور مال و دولت کی ریل پیل ہی سہی لیکن اس میں اسراف کسی بھی حال میں درست اور جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے تبذیر سے کام لینا ہی صحیح اور قابل قدر ہے بلکہ اس کی مذمت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین اور اہل تقویٰ کی صفات کو بیان کرتے ہوئے اسراف و تبذیر سے اجتناب کو خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ اللہ کے بندے وہ لوگ ہیں جو اپنی معاشرتی زندگی میں اسراف و تبذیر سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ وہ تو ان دونوں کے درمیان معتدل حالت میں رہتے ہیں، جب اس کا تقاضہ اسراف یا تبذیر کا ہوتا ہے تو وہ دونوں ہی صورتوں میں اعتدال کی راہ پر کاربند رہتے ہیں۔

پانی ایک اہم نعمت ہے:

قیامت کے دن جہاں اللہ تعالیٰ دوسری چیزوں کے بارے میں سوال کرے گا اور دریافت

کرے گا تو وہیں ایک سوال نعمتوں کے بارے میں بھی ہوگا کہ تو نے میری ان نعمتوں کو کس کس طرح خرچ کیا اور اس کی قدردانی کس طرح کی۔

فرمان الٰہی ہے: ''تم سب قیامت کے دن تمام ہی نعمتوں کے بارے میں سوال کئے جاؤ گے'' (التکاثر: ۸) اور بغیر حساب وکتاب دیئے وہاں سے ہٹ نہیں سکو گے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت پانی بھی ہے جس کے بغیر انسان وحیوان کا جینا ممکن ہی نہیں ہے اور یہ انسان کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ دیگر چیزیں ہوا وغیرہ ہیں۔ لہٰذا اس کی بھی قدر کرنی چاہئے اور اس سلسلے میں بھی اسراف سے بچنا چاہئے۔

ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کی ممانعت

نبی اکرم ﷺ نے پانی کے سلسلے میں اسراف کو اس حد تک بھی گوارہ نہیں فرمایا ہے کہ کوئی شخص نہر کے کنارے بیٹھا ہوا وضو کر رہا ہو اور اس میں ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کر رہا ہو۔ بھلا جہاں پانی کی قلت ہو اور حیوان تک اس کے لئے ترس رہا ہو وہاں کب نبی ﷺ اسراف کو برداشت کر سکتے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ وضو میں ایک مُد کبھی دو تہائی مُد اور کبھی اس سے زیادہ پانی استعمال فرماتے تھے اور آپ امت کو بھی ہمیشہ وضو میں اسراف سے منع فرماتے تھے اور خود وضو میں کم سے کم پانی استعمال کرتے تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صحیح روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ ایک صاع (چار مد) سے لے کر پانچ مد تک پانی سے وضو کرتے تھے اور ایک مد پانی سے (بھی) وضو کرتے تھے (بخاری: جلد ۱، صفحہ ۳۳)

یہ ہے سید الانبیا ﷺ کا طریقہ وضو اور پانی میں احتیاط کا اسوہ حسنہ لیکن افسوس نبی ﷺ کے امتی ہونے کے باوجود ہمیں پانی میں اسراف کا خیال بھی دل میں نہیں آتا اور بے دریغ پانی استعمال کرتے ہیں اور یہ ایسا مرض ہے جس میں جاہل سے لے کر اہلِ علم طبقے تک مبتلا ہیں۔

آج ایک آدمی کے مقدار پانی سے کئی اشخاص وضو کر سکتے ہیں لیکن پانی کی اتنی قلت ہونے کے باوجود ایک آدمی اتنا پانی خرچ کرتے ہیں اور دوسروں کا خیال تک نہیں کرتے۔ نمازی حضرات جن کا معاشرہ اور سماج میں کچھ مقام و مرتبہ ہوتا ہے وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں جب وہ وضو خانہ میں بیٹھتے ہیں تو ٹوٹی کھول کر وضو کرتے ہیں اور ایک عضو سے دوسرے عضو دھونے تک بے دریغ پانی بہتا رہتا ہے

جبکہ وضو کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ پانی کم سے کم خرچ ہو۔ بعض ذمہ داران مساجد، مساجد میں لکھ دیتے ہیں کہ "برائے مہربانی پانی کم خرچ کریں"، لیکن اس کے لئے وہ کوئی موثر طریقہ اختیار نہیں کرتے کہ جس سے لوگوں کو پانی کم خرچ کرنے میں سہولت حاصل ہو۔

اگر اسراف سے نہ بچا جائے تو اس کا نتیجہ کسی اور کو بھگتنا نہیں پڑتا ہے بلکہ خود اس کا مرتکب ہی اس مصیبت سے دوچار ہوتا ہے اور اس وقت اس کو احساس ہوتا ہے کہ کاش ہم اسراف سے کام نہ لئے ہوتے مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے اب تو اپنے کئے کا مزہ چکھنا ہی پڑے گا۔

اس کے ساتھ ہی ہم پانی کو ضائع و برباد اور خراب ہونے سے بچائیں اور اس کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کو ناپاک نہ ہونے دیں، اس میں کوئی ناپاک چیز نہ ڈالیں اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "جب وہ سو کر اٹھیں تو وہ اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں نہ ڈالیں جب تک کہ اسے دھو نہ لیں اس لئے کہ تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گذاری ہے (بخاری: جلد ۱، صفحہ ۲۸)

اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ ہاتھ موضع نجاست پر چلا جائے اور نجاست لگ جائے اور جب نجس ہاتھ کو پانی میں ڈالے گا تو لامحالہ پانی ناپاک ہو جائے گا جس کی وجہ سے نبی ﷺ نے بغیر دھوئے ہاتھ کو پانی کے برتن میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

باؤلی، تالاب وغیرہ میں ناپاکی اور غلاظت وغیرہ ڈالنے سے احتراز کریں اگر اس میں کوئی نجس اور ناپاک چیز گر جائے تو اس کو باہر نکال کر پھینک دیں اگر کوئی اس کا اہتمام نہ کرتا ہو تو اس کو سمجھا بجھا کر اس طرح کی حرکتوں سے باز رکھیں اور پانی کو ضائع اور ناقابل استعمال ہونے سے بچائیں اور اس کے لئے جو بہتر طریقہ ہو اپنائیں۔

الغرض ہر شخص کو چاہئے کہ وہ پانی میں اسراف کرنے سے بچیں اور پانی کو ناپاک اشیاء اور نجاست و غلاظت سے محفوظ رکھیں اس سے ہمارا ہی فائدہ ہے اور ہمارے ہی مشکلات ختم ہوں گے ورنہ تو اس کا نتیجہ بھی ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا اور نقصان و مضرت بھی ہمیں ہی لاحق ہوگی اور ہم ہی دردر پانی کے لئے بھٹکتے پھریں گے۔ لہٰذا تمام ہی لوگ پانی کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے مضر پہلو سے بچنے کی کوشش کریں!

(۲۶ر ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ)

*****

آبی قلت .... انسانی اعمال کا نتیجہ

اس کائناتِ عالم میں ایک عجیب طرح کا نظام الٰہی کارفرما ہے، کہیں ابھی دن ہے تو کہیں رات، کہیں صبح ہے تو کہیں شام، کہیں گرمی ہے تو کہیں سردی اسی طرح سے اس عالم کے بعض خطے ایسے ہیں اور ان کا معاملہ ایسا عجیب وغریب ہے کہ خود ہندوستان کے بعض خطے والے پانی کی کثرت سے حیران وپریشان ہیں اور وہاں پانی کی کافی فراوانی ہے اسی لئے وہاں پانی کی کوئی قدر وقیمت اور حیثیت ہی نہیں ہے اس لئے کہ عمومی طور پر جہاں جس چیز کی فراوانی ہوتی ہے تو وہاں اس چیز کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی ہے، لیکن اس کے بعض خطے ایسے بھی ہیں جہاں پانی کی کافی قلت ہے، پیاس بجھانے کے لئے بڑی مشکل اور پریشانی سے تھوڑا سا پانی ملتا ہے اور وہاں کے باشندے آبی قلت کی وجہ سے حیران وپریشان ہیں، اس لئے کہ وہاں پانی کی کثرت اور فراوانی نہیں ہے، اگر واقعتاً آپ کو پانی کی اہمیت معلوم کرنی ہو تو آپ وہاں کے باشندوں سے اس کی قدر وقیمت دریافت کرلیں تو معلوم ہوجائے گا کہ پانی کی کیا اہمیت ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ”تو بہر حال جب انسان کو آزماتا ہے ان کا پروردگار تو ان کا اکرام کرتا ہے اور ان کو نعمتوں سے نوازتا ہے اور بہر حال جب (مخالف پہلو سے) ان کو آزماتا ہے تو ان پر ان کی روزی تنگ کردیتا ہے“ (الفجر: ۱۵،۱۶) امتحان وآزمائش کے یہی دو طریقے ہیں جن کو مذکورہ آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اکرام وانعام اور نوازش کرکے آزماتا ہے اور کسی کا ان سے اپنی نعمتوں کو چھین کر امتحان لیتا ہے، تو اسی اصول کی بناء پر وہ علاقے اور خطے جہاں پانی کی کثرت ہے، اس میں وہاں کے باشندوں کی آزمائش ہے اور جہاں اسکی قلت ہے تو وہاں کے باشندوں کی بھی کڑی آزمائش ہے۔

تمام چیزوں کی کثرت وقلت اسی وقت تک آزمائش اور امتحان رہتی ہے جب تک کہ وہ عام حالت میں ہو لیکن جب وہی کثرت وقلت اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ امتحان نہیں رہتا بلکہ وہ عذابِ الٰہی ہو جاتا ہے، وہ قہر خداوندی کی ایک صورت ہوتی ہے اور وہ انسان کے اعمالِ بد کا نتیجہ ہوتا ہے، پھر اسی اصول پر ان علاقوں کو دیکھیں جہاں پانی کی کثرت اور فراوانی ہے اور وہ کثرت اس حد کو پہونچی ہوئی ہے کہ اس سے انسان وحیوان اور دیگر مخلوقات عاجز ہیں اور وہ کثرت انکی ہلاکت و بربادی کا سبب بھی بن رہی ہے تو یہ عذاب الٰہی کی ایک صورت ہے۔

اس کے برخلاف جہاں پانی کی قلت ہے اور وہ اس حد کو پہونچی ہوئی ہے کہ انسان اسکی وجہ سے پیاسوں مر رہے ہیں، پانی کے لئے ترس رہے ہیں اور چرند و پرند اور دیگر مخلوقات بھی پریشان ہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ اللہ کی جانب سے ان علاقے والوں کے اوپر قہر خداوندی ہے۔

اس طرح کا عذاب الٰہی یوں ہی انسانوں پر نہیں آتا ہے بلکہ اس کے اسباب بھی خود حضرت انسان ہی بنتے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ باز آجائیں'' (الروم: ۴۱) اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے مصائب وآلام اور عذاب و بلائیں صرف اور صرف انسانی اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے جوانہوں نے اس سے پہلے کیا ہے اور اسی کا نتیجہ اب ان کے سامنے عذاب کی صورت میں موجود ہے جس سے وہ عاجز اور حیران و پریشان ہیں اور اس سے وہ نجات کی مختلف صورتیں اختیار کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس طرح کا عذاب اس لئے نازل کرتا ہے تاکہ وہ گناہوں سے باز آجائیں۔

اس عذابِ الٰہی اور ان بلاؤں سے نجات کا طریقہ بھی خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی بیان کر دیا ہے چنانچہ فرمان الٰہی ہے ''اور اے میری قوم اپنے پروردگار سے اپنا گناہ معاف کراؤ پھر اس کی طرف رجوع (توبہ) کرو، وہ تمہارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا ......اور اعراض مت کرو'' (ہود: ۵۲)

گناہ اور نافرمانی قحط سالی اور بھوک مری کا سبب ہے اور اس کے مقابلہ میں استغفار وتوبہ اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نوازش اور نزولِ رحمت وبرکت کا سبب ہے، اسی کو ''المغنی'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''معاصی انقطاع بارش کا سبب ہے اور استغفار وتوبہ ان گناہوں کو مٹاتی ہے جس کی وجہ سے بارش

نہیں ہو رہی ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو لاتا ہے'' یعنی بارش برساتا ہے (المغنی: ۱۵۲/۲)

ایک مرتبہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ استسقاء کے لئے نکلے، منبر پر چڑھے تو آپؓ نے فرمایا ''اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا'' (نوح: ۱۰، ۱۱) تم سب اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی کرالو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے وہ تمہارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا تو امیر المومنین سے کہا گیا '' کاش کہ آپ نمازِ استسقاء پڑھتے'' تو آپ نے فرمایا جب تک تم اللہ کا اکرام کرو گے تو وہ ان گناہوں کو معاف کردے گا جو بارش نہ ہونے کا سبب ہیں اور نمازِ استسقاء پڑھنے سے (اس وقت تک کوئی) فائدہ نہیں ہوتا ہے جب تک کہ بارش نہ ہونے کا سبب باقی رہے اور وہ گناہ موجود ہے'' (موسوعة فقه عمر بن الخطاب: ۵۹۰) اس لئے سب سے پہلے اپنے اپنے گناہوں سے معافی چاہو نہ کہ نمازِ استسقاء کے لئے دوڑو۔

اسی لئے امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف علیہما الرحمتہ فرماتے ہیں کہ ''استسقاء میں کوئی مسنون نماز مشروع نہیں ہے جماعت کے ساتھ اور نہ ہی اس میں خطبہ ہے لیکن دعا اور استغفار وغیرہ مشروع ہے اور اگر کوئی تنہا نماز پڑھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے'' (الفتاویٰ الھندیہ: ۱۵۳/۱)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جو نمازِ استسقاء کے قائل ہیں وہ بھی اسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنی مشہور کتاب ''کتاب الام'' میں تحریر فرماتے ہیں ''اور امام بغیر نماز کے پانی طلب کرے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی نماز پڑھ کر پانی طلب کرے'' (کتاب الام: ۲۴۸/۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں سند عالی کے ساتھ کئی روایات نقل کی ہیں کہ نبی ﷺ نے جمعہ کے دن دورانِ خطبہ استسقاء کی دعاء فرمائی لیکن اس کے لئے کوئی نماز نہیں پڑھی (بخاری: ۱۲۷/۱، مسلم: ۲۹۳/۱)

احادیث نبوی ﷺ، آثارِ صحابہؓ اور اقوالِ ائمہؒ کی روشنی میں نمازِ استسقاء ضروری نہیں ہے بلکہ ضروری تو گناہوں سے توبہ اور استغفار ہے جو ان بلاؤں کا سبب ہے اور جس کیوجہ سے بارش منقطع ہے، اس لئے ہم اول مرحلہ میں گناہوں سے باز آجائیں تو یہ عذابِ الٰہی ہم سے ٹل سکتا ہے۔ اور اس کے بعد اللہ کی رحمت کی بارش ہوگی۔

(۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ)

***

کھیل کود اور اس کے اسلامی حدود

اسلام نے ہر عمل کے لئے بعض حدود متعین کئے ہیں ۔ اگر اس حدود کے اندر رہ کر کوئی بھی کام انجام دیا جائے تو وہ جائز و مباح ہی نہیں بلکہ قابل تحسین و ستائش بھی ہے اور لائق اجر وثواب بھی نیز کامیابی و کامرانی کا ضامن بھی ۔ اور اگر اسلامی حدود سے ہٹ کر کوئی کام کیا جائے اس میں اسلامی مزاج اور تعلیمات کا خیال نہ رکھا جائے تو وہ کام خواہ کتنا ہی عالیشان پیمانہ کا ہو، وہ کامیابی و کامرانی کا ضامن نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں انسان کا نقصان ہوتا ہے اور حسرت ومحرومی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے ۔ یہی حال کھیل کود کا ہے ..... کھیل کود پر اسلام نے پابندی نہیں لگائی ہے لیکن کھیل کود ایسا ہونا چاہئے جو اسلامی حدود کے اندر ہو اسلامی تعلیمات کے مغائر نہ ہو، ایسا کھیل کود ہرگز پسند نہیں ہے جس میں مشغول ہونے سے وقت ضائع ہوتا ہو اور اسلامی ارکان کا ترک لازم آتا ہو، یا پھر اس کھیل کود میں ایسا عمل سرزد ہوتا ہو جس کو کرنے سے اسلام نے روکا ہے، موجودہ دور میں کھیل کود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اسی کی ایک کڑی آندھرا پردیش میں منعقدہ نیشنل گیمس ہے۔

آندھرا پردیش کے دارالحکومت حیدرآباد میں ۱۳ ر ڈسمبر ۲۰۰۲ء کو نیشنل گیمس کا رنگارنگ اور نظروں کو خیرہ کر دینے والی پراثر تقریب کے ساتھ افتتاح عمل میں آیا جس کے لئے اس کے روح رواں چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر این چندرا بابو نائیڈو صاحب قابل مبارک باد ہیں ۔ یہ نیشنل گیمس اپنے اندر کئی معنویت کو پنہاں رکھتا ہے لیکن اس میں بہت سارے ایسے گیمس بھی ہیں جو اسلامی مزاج و مذاق کے خلاف ہیں لیکن بہت سارے ایسے بھی ہیں جن کے نتائج وثمرات کسی میدان کارزار میں سامنے آتے ہیں یہ ایک طرح کی عسکری ورزش یا یوں کہئے کہ جنگی مشق ہے اس سے جنگی میدان میں کام کرنے میں اس میں حصہ لینے میں اور اس میں اپنی شجاعت و بہادری کے مظاہرہ کرنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے ورزش، گھوڑ دوڑ، تیراندازی اور تلوار چلانے کی ترغیب دی ہے اور ان کے لئے انعامی اور تشجیعی مقابلے بھی منعقد

کئے ہیں اور ان میں میدان جیتنے والوں کو آپ نے انعام سے نوازا ہے لیکن یہ سب دو طرفہ شرط کے ساتھ نا جائز ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے بذات خود ایک صحابی سے کشتی کا مقابلہ فرمایا ہے۔ ہوا یہ کہ اس زمانے کا ایک لحیم و شحیم اور موٹا تازہ نوجوان آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا اے محمد (ﷺ) اگر آپ مجھے کشتی میں شکست دے دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا تو آپ اس کے لئے تیار ہو گئے اور آپ نے ان کو شکست دے دی تو انہوں نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) میرا فلاں داؤ چھوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے آپ نے مجھے پچھاڑ دی پھر دوبارہ کشتی کیجئے تو آپ نے ان کو پھر دوبارہ شکست دے دی تو اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے مقابلے اور کھیل کود حرام نہیں بلکہ جائز اور حلال ہیں۔

نفس کھیل کود تو جائز ہے اور اس میں کسی طرح کی کراہت نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ اس طرح کے لوازمات اور افعال ہونے لگے ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ حرام اور لائق مذمت بھی ہے۔ اول تو آج کل کے کھیل کود میں اسراف یعنی فضول خرچی حد سے زیادہ ہوتی ہے جب کہ قرآن میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے ''اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ'' (بنی اسرائیل: ۲۷) بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ چنانچہ آندھرا پردیش میں ہونے والے اس نیشنل گیمس کو دیکھ لیجئے کہ اس میں حد سے زیادہ فضول خرچی ہوئی جیسے آتشبازی اور لیزر شعاؤں کا مظاہرہ اسی طرح سے غباروں اور ایرفورس طیاروں کے ذریعہ قومی ترنگا بنانا غرض کہ اگر ان فضول خرچیوں میں استعمال ہونے والی رقم کو کسی فلاحی کام میں خرچ کیا جاتا تو کہیں زیادہ بہتر ہوتا اور اس سے ریاست کے بہت سارے بگڑے ہوئے کام بن سکتے تھے۔

دوسری چیز ''رقص و سرور'' کا مظاہرہ ہے جس کی شریعت اسلامیہ میں قطعا گنجائش نہیں ہے اور رقص و سرور کے بارے میں احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں جب کہ اس نیشنل گیمس میں رقص و سرور امتیازی حیثیت کا حامل تھا جس کی وجہ سے شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

تیسری چیز مرد و زن کا اختلاط ہے جیسا کہ یہ تقریب بھی اس اختلاط سے محفوظ نہیں رہ سکا اور رہتا بھی کیسے؟ جب کہ انتظام بھی اس طرح کیا گیا تھا کہ مرد و زن کے اختلاط سے گریز ممکن ہی نہیں تھا جیسا کہ اخبارات میں شائع شدہ شائقین کی تصویر سے پتہ چلتا ہے، عورتوں کے لئے بھی کھیل کود کا

دیکھنا جائز ہے، چنانچہ ایک مرتبہ جب چند حبشی بچے مسجد نبوی میں کھیل کود کا مظاہرہ کر رہے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کھیل کا مشاہدہ کرایا تھا جیسا کہ کتب حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے (بخاری: ۱/۶۵) لیکن عورتوں کو پردہ کرنا لازم ہے۔ قرآن کریم کے اندر عورتوں کو غیر محرم مردوں کے سامنے سختی کے ساتھ بے پردگی سے روکا گیا ہے اور ان کو تاکید کے ساتھ پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے ''لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ'' (النور: ۳۱) اور آج کل کھیل کود، تماشہ بینی اور کسی بھی تقریب کے موقع پر اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے، ایک طرف عورتیں بے پردگی کے ساتھ ہوتی ہیں تو دوسری طرف مرد بھی ان کی طرف نظر کرنے سے احتراز نہیں کرتے اور دونوں اختلاطی طور پر شریک تقریب ہوتے ہیں جبکہ یہی اختلاط فساد جنسی کا باعث ہے نیز یہی اختلاط دہشت گردی اور لڑکیوں کے اغواء کا بھی باعث ہے اور اخبارات میں بھی برابر لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر یا اغواء کی خبریں آتی رہتی ہیں اگر یہ اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے یہ کھیل کود پاک ہو تو اس کے جائز ہونے میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ایسا کھیل نہ ہو جو تضیع اوقات کا سبب ہو اور اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا ہو جیسا کہ لوڈو اور کنکوی وغیرہ کا کھیل ہے کہ اس سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے اسلئے قیمتی وقت ضائع اور برباد ہوتا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔

کرکٹ، والی بال وغیرہ کھیل جائز ہے جس کا کہ آج ہر طرف سہرہ ہے یہ تضیع اوقات میں شامل نہیں ہے جب کہ اس کے بہت سارے فوائد ہیں اس سے ورزش ہوتی ہے جس کے متعلق بڑے لوگوں اور حکماء کا قول ہے کہ ورزش سو بیماریوں کی دوا ہے اس سے بدن میں چستی، چالاکی، پھرتی اور تیزی پیدا ہوتی ہے اور صحت بھی تندرست اور قابل اطمینان رہتی ہے۔ اسی طرح سے تیراکی ہے جو جنگی مشق ہے اس کی مدد سے بحری راستوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور یہ دشمنوں پر بحری حملہ کرنے میں ممدو معاون ہے، اس کی مدد سے دشمنوں کی کشتی اور آبی جہاز پر حملہ کیا جاسکتا ہے اور آج امریکہ اسی کی مدد سے بہت سارے حملوں سے محفوظ ہے حتی کہ اسی جنگی مصلحت کے پیش نظر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے شطرنج کو جائز قرار دیا ہے کہ اس سے ذہنی اور عسکری تربیت ہوتی ہے اور اس کے فوائد میدان کارزار میں سامنے آتے ہیں (ہدایہ کتاب الکراہت) البتہ امام ابو حنیفہؒ نے شطرنج کو صحیح قرار نہیں دیا ہے اس لئے کہ پہلے زمانے میں بڑے بڑے حضرات اس کھیل میں گھنٹوں گذار دیا کرتے تھے۔

ایک ضروری وضاحت ..... یہ سارے کھیل کود اسی وقت جائز ہیں جب تک کہ یہ دینی احکام

اور شرعی امور کی ادائیگی میں حائل اور رکاوٹ ثابت نہ ہوں اور ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے نماز بھی ترک ہو جائے اور آج کل اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سارے دینی احکام اور شرعی امور ترک ہو جاتے ہیں حتی کہ نماز جو دین اسلام کی بنیاد ہے وہ بھی فوت ہو جاتی ہے لہذا کلام آخر کے طور پر میں تمام مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کروں گا کہ وہ شریعت مطہرہ اور قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے حدود کے مطابق کھیل کود کا مظاہرہ اور مشاہدہ کریں اور ہماری یہ اولین کوشش ہو کہ ہماری نماز فوت نہ ہونے پائے... واللہ هو المستعان۔

(۱۵ر شوال المکرّم ۱۴۲۳ھ)

***

ہندوستان پر دینی مدارس کے احسانات

تیرہویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستان میں ساڑھے آٹھ سو سالہ اسلامی شان وشوکت کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا، سلطنت مغلیہ چراغ سحر گاہی کی طرف ٹمٹما رہی تھی، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے، الحاد وارتداد کے طوفانِ بلاخیز میں ہندوستان بالخصوص دہلی کے تمام مراکز دینیہ متزلزل ہو چکے تھے، جہل وضلال مسلم قلوب پر چھاتا جارہا تھا، مشرقی روشنی چھپتی جارہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہورہا تھا۔

ان حالات سے یہ یقین ہو چکا تھا کہ شاید اسلامی ہند میں اب اسلام کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے، لیکن ایسے پُرخطر حالات میں خدا تعالیٰ نے چند ایسی شخصیتوں کو پیدا کیا جنہوں نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا، انہیں نفوس قدسیہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت بھی ہے جنہوں نے علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کے لئے ''دارالعلوم دیوبند'' کو قائم فرمایا اور اس کے بعد پورے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا اور اسلامی تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ برطانوی تہذیب وتمدن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اگر دارالعلوم دیوبند اور ان دینی مدارس کے جال نہ ہوتے تو اس سرزمین ہند پر بھی اندلس (موجودہ اسپین) کے واقعے کو دہرایا جاتا اور ہندوستان سے دینِ اسلام کو حرف غلط کی طرح مٹا کر ہر فرد مومن کے لوح قلب ودماغ میں عیسائیت کی بیج بو دی جاتی۔

لیکن ان دینی مدارس کے علماء نے تحریک آزادی کا نعرہ بلند کر کے دین وشریعت کے تحفظ کے لئے اپنی جانوں کا بے دریغ نذرانہ پیش کیا، اور برطانوی سامراج کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بالآخر دوسری جنگ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور جب برطانوی اقتدار کا یہاں سے جنازہ نکل گیا تو اب دینی مدارس کا راستہ بالکل ہموار ہوگیا اور اب ان مدارس کو پھلنے

اور پھولنے کا بڑا سنہرا موقع ملا، چنانچہ علماء کرام کی بے مثال قربانیوں کے نتیجہ میں وہ دن بھی آ گیا کہ جہاں سے اسلامی شعائر زائل ہو رہے تھے وہ زائل ہونے سے بچ گئے اور جہاں دینی علوم اور تعلیم گاہیں ختم ہو رہی تھیں وہ کھل کر میدان میں آگئیں اور جہاں جہل و ضلال مسلم قلوب پر چھاتا جارہا تھا اب ان مسلم قلوب پر رشد و ہدایت کی کلیاں کھلنے لگیں اور جہاں سے مشرقی روشنی چھپتی جارہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اب وہاں علوم نبوی ﷺ نے جگہ لے لی۔

اُسی دارالعلوم نے ''شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ۔ مولانا سید رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم مہدی حسنؒ شیخ زکریاؒ اور دیگر عظیم الشان شخصیتوں کو پیدا کیا جن میں بعض نے اہلِ ہند کے لئے تفسیر کے علوم کو فروغ دیا جن میں شیخ الہند اور حکیم الامتؒ قابل ذکر ہیں اور بعض نے احادیث نبویہ ﷺ کی خدمت کو پیش کیا جن میں شیخ الاسلامؒ، مولانا کشمیریؒ اور شیخ زکریاؒ سرفہرست ہیں، چنانچہ جب مولانا کشمیریؒ نے غیر مقلدین کے ساتھ مناظرہ کرتے ہوئے احادیث سنانا شروع کیا تو غیر مقلدین حضرات ''بوریہ، بستر'' سمیٹ کر بھاگنے لگے اور بعض نے فقہ وافتاء کا کام انجام دیا جن میں شیخ الہندؒ، مولانا گنگوہیؒ، حکیم الامتؒ، مولانا کشمیریؒ اور مفتی مہدی حسنؒ قابلِ فخر افراد ہیں۔

انہی علماءِ دیوبند میں سے بعض نے قرآن وحدیث اور اسلامی شعائر کو بچانے کے لئے اپنے نفس کو وقف کر دیا جن میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ہیں کہ جب وہ عدالت میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے ساتھ بحیثیت ملزم پیش کئے گئے تو حضرتؒ نے اپنے بیان کے آخر میں جو الفاظ فرمایا وہ ''افضل الجهادِ كلمةُ عدلٍ عندَ سلطانٍ جائرٍ ''(ابن ماجہ: ۲۸۹) کا بہترین نمونہ ہیں، آپؒ نے فرمایا کہ اگر ''لارڈ ریڈنگ'' ہندوستان اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ وہ قرآن کو جلا دیں، حدیث کو مٹا دیں اور فقہ کی کتابوں کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا (سبحان اللہ)

جب عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے پر جوش اور جذبات سے بھرے انداز میں آپؒ نے آخری جملہ فرمایا تو تمام مجمع نے بآوازِ بلند ''جزاك الله ''اور'' مرحبا'' کہا اور مولانا محمد علی جوہرؒ نے آگے بڑھ کر شیخ الاسلامؒ کے قدم چوم لئے اور حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ الاسلامؒ نے انبیاء کی نیابت اور امت کی سچی قیادت فرمائی اور مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے پورے ملک میں مدارس کا جال

پھیلایا جن سے مسلمانوں میں تعلیمی سدھار کے ساتھ شعور زندگی پیدا ہوا، (خطبات مغیثی۔ جلد ا، صفحہ ۴۶۵)

آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمیں اور امت کو ان مدارس عربیہ سے کیا ملتا ہے؟ ہمیں ان سے ڈگریاں نہیں ملتیں، ہمیں سرکاری ملازمت نہیں ملتی، ہمیں نوکری نہیں ملتی۔

تو ایسے ذہن والوں سے میں پوچھتا ہوں کہ کیا اسکول وکالج کے تمام پڑھے ہوؤں کو ملازمت مل جاتی ہے؟ جب نہیں ملتی اور یقیناً نہیں ملتی تو مدارس عربیہ کے ان طلباء پر حرف شکایت کیوں؟ رہا ان طلباء کا حال تو بقول مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندویؒ میں چیلنج کرتا ہوں کہ مدارس عربیہ کا کون سا ایسا حافظ، عالم، فاضل اور مفتی ہے، جو فقر و فاقہ کی زندگی گذار رہا ہو، بھوکا مر رہا ہو، ذلت و رسوائی کی کا میں کر رہا ہو، اور ذرہ کالج کے طلباء کو دیکھو کہ وہاں کے کتنے ہی ایسے طلباء ہیں جو کہیں رکشہ چلاتے ملیں گے، کہیں ہوٹلوں میں کام کرتے دیکھائی دیں گے ...ان طلباء مدارس عربیہ پر اللہ رب العزت کا خاص لطف و کرم اور احسان ہے کہ یہ فقر و فاقہ کی موت نہیں مرتے، ذلت و رسوائی کے کام نہیں کرتے، بشرطیکہ طلباء مدارس عربیہ اپنے علم کی قدر بھی کرتا ہو اور اس کی حیثیت بھی سمجھتا ہو۔

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں مدارس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، یہ دینی مدارس تعلیم و تربیت کے وہ مراکز ہیں جہاں سے امت مسلمہ کو علمی و فکری رہنمائی ملتی ہے اور یہیں سے دین متین کی حفاظت و صیانت کا فریضہ انجام دینے والے اور اسلام اور اسلامی اقدار کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے افراد پیدا ہوتے ہیں، یہی ادارے مسلمانوں کے مذہبی و تہذیبی ورثہ کے تحفظ اور ان کا امت سے رشتہ جوڑنے و مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور اسی محاذ سے دین پر داخلی و خارجی حملوں سے دفاع کا سامان فراہم ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ دینی مدارس قرآن وسنت کے نہج پر سیرت و کردار کی تشکیل اور صالح خطوط پر زندگی کی تعمیر کے کارخانے ہیں، اور یہ اسی لئے قائم کئے جاتے ہیں تاکہ امت کو قرآن وسنت اور فقہ کے ماہرین، دین کے خادم، معلم و مبلغ اور داعی و مصلح فراہم کر سکیں، گرچہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کا اہتمام بالکل ابتدائی دور سے ہی ملتا ہے لیکن مدارس کا باقاعدہ قیام چوتھی صدی ہجری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (ماہنامہ ''ترجمان الاسلام'' ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۱)

ان ہی مدارس سے ایسے باصلاحیت افراد نکلتے ہیں جو مختلف علوم وفنون میں مہارت کے حامل ہوتے ہیں جو اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی موثر ترجمانی کرتے ہیں اور اسلامی عقائد،

تعلیمات وقوانین پر مخالفین و معاندین کے اعتراضات وشبہات کا ازالہ کرتے ہیں اور اسلام کا دفاع کرتے ہیں،

دینی مدارس کا احسان تو امت مسلمہ کے لئے ان کے خدمات ہوتے ہیں نہ کے مالی احسانات امتِ مسلمہ کے لئے دین اسلام کی حفاظت وصیانت کرنے والے افراد کا پیدا کرنا اور امت کے لئے قرآن وسنت اور فقہ کے ماہرین، دین کے خادم، معلم، مبلغ، داعی، مصلح، امام وخطیب اور مفکر کا پیدا کرنا ہی سب سے بڑا احسان ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی احسان ہو ہی نہیں سکتا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود اور ان کا ملی تشخص مدارس عربیہ سے وابستہ ہے، مدارسِ عربیہ دین کے قلعے اور اسلامی چھاؤنیاں ہیں اور ملت کا عظیم سرمایہ ہیں اور یہ ایسی عملی تجربہ گاہ ہیں جہاں سماج، معاشرہ اور ملک وملت کے لئے تعمیر ساز ذہن رکھنے والے افراد تیار کئے جاتے ہیں، حتی کہ سماج کا روشن مستقبل بھی ان ہی مدارس عربیہ کے وجود سے وابستہ ہے، مدارس عربیہ مسلمانوں کے ایمان وعقائد کی حفاظت اور اسلام وشریعت کی بقاء وتحفظ کے لئے بنیادی اور ٹھوس کردار ادا کر رہے ہیں، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی علامت یہی مدارس عربیہ ہیں، اور یہی مدارس عربیہ اخلاقی اقدار کی ترقی اور صحیح نظریۂ حیات کی تعمیر کے کاموں میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں، مدراس عربیہ نے اسلام کی ترویج واشاعت اور ان کے اقدار کے تحفظ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ اور اس وقت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ ہمارے اکابرین قائم نہ کرتے تو ملت اسلامیہ ہند کے لئے اپنا تہذیبی تشخص اس ملک میں برقرار رکھنا دشوار تر ہو جاتا اور اسلامی شناخت مسلمانوں سے ختم ہو جاتی۔ (خطبات مغیثی۔جلد ا، صفحہ ۱۴۹)

یہی مدارس عربیہ صحیح معنوں میں اسلامی اقدار کے محافظ ہیں، انہی مدارس میں اسلام کے روح پرور تعلیمات پر عمل ہوتا ہے، لہٰذا پہلے ہم مدارسِ عربیہ کی ضرورت واہمیت کو سمجھیں، ان کی لابدیت کو محسوس کریں اور اپنے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ اس ظلمت وتاریک دور، پرفتن زمانہ اور عہد ارتداد میں مدارسِ اسلامیہ کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا بقاء کتنا ضروری ہے، ان سے تعلق وربط کس قدر ضروری ہے، مدارس عربیہ سے کنارہ کش ہونا اور ان سے غفلت برتنا مسلمانوں کے لئے کتنا نقصان دہ ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ آج کے دور میں مدارس عربیہ کے بقاء اور تحفظ کی ذمہ داری مسلمانوں پر اخلاقی ومذہبی فریضہ ہے اگر ان کی حفاظت نہ کی جائے تو وہ دَور دُور نہیں جب اس سرزمین ہند پر دوبارہ

مسلمانوں پر ظلم وستم کا پہاڑ ڈھایا جائے ، قرآن وحدیث کو جلایا جائے ، فقہ کی کتابوں کو برباد کیا جائے اور ہند سے نکلنے پر مجبور کیا جائے نیز موجودہ دور میں مدارس عربیہ کو بدنام کیا جارہا ہے ان کو ختم کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں اور فرقہ پرست تنظیموں کی نگاہ بدان مدارس عربیہ پر ٹکی ہوئی ہے۔

لہٰذا تمام اہلِ ایمان مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ جب ان مدارس کی اتنی خدمات مسلمانان ہند کے لئے وقف ہیں، تو ان مدراس کی ہر طرح حفاظت کریں ، تمام مسلمانانِ ہند مدارس کی ذمہ داری کو سمجھیں اور اپنی اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

***

دینی تعلیم اور مدارسِ اسلامیہ......ضرورت واہمیت

دینی تعلیم انسان کے لئے ایک لازمی ضرورت ہے اور اس سے انسان کا ہمکنار ہونا نہایت ہی اہم اور ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں مذہب کی تعلیم اس کے ماننے والوں کے لئے اہم نہ ہو اور ہر مذاہب عالم میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دنیا کی قدیم ترین قوم ہمارے برادران وطن میں بھی مذہبی تعلیم کا رجحان ہی نہیں بلکہ اس کی ترغیب وترہیب بھی ہے۔ اسی لئے وید میں یہ بات مذکور ہے کہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والوں اور ان کے عبادت گذار بندوں کے لئے بھیک مانگنا جائز ہے اور ان کو بھیک دینے پر بے انتہا اجر وثواب کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، چنانچہ فی الحال ہندو انتہاء پسند تنظیمیں آر ایس ایس، وشوا ہندو پریشد، شیوشینا اور بجرنگ دل وغیرہ اپنی مذہبی تعلیم کے لئے بے انتہا کوشش اور جد وجہد کر رہی ہیں۔ اسی طرح یہودی اور نصرانی بھی اپنی اپنی مذہبی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کے لئے سرکاری طور پر مذہبی ادارے قائم کرتے ہیں۔

الغرض مذہبی تعلیم کو ہر قوم نے اہمیت دی ہے لیکن اسلام نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین اور تعلیمات کو ساری انسانیت کی ہدایت اور کامیابی وکامرانی کے لئے ضروری قرار دیا چونکہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات انسانوں کی کلی طور پر رہنمائی نہیں کرتی ہیں۔ شارع اسلام حضرت محمد عربی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم '' ابن ماجہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور یہاں علم سے مراد '' دینی علوم '' ہی ہیں۔

دین محمدی کا علم ایک ایسا اہم ترین نسخہ ہے جو انسان کو انسانیت پر باقی رکھتا ہے اور اس کو انسانیت کے ڈگر سے ہٹنے نہیں دیتا۔ اس علم کو حدیث پاک میں '' نور '' کہا گیا ہے اور نور کا کام اور اس کی خاصیت انسان کو روشنی دکھانا ہے، اس اعتبار سے علم انسان کو ہر چیز کا راستہ بتاتا اور دکھاتا ہے اور اس کی فکری اور روحانی رہنمائی کرتا ہے اور دنیا وآخرت کے ہر میدان میں اس کا ساتھ دیتا

ہے، یہی وہ دینی علوم ہے جو انسان کو راہ راست پر لاتا اور ایمان پر لبیک کہلواتا ہے۔ ایمان قیامت کے دن نور کا باعث ہوگا ارشاد ہے ''نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ'' (التحریم: ۸) اسی طرح علم ایک خوشبو ہے جس سے ہر شخص انفرادی طور پر مستفید ہوسکتا ہے اور اس کے حصول میں کسی امیر و غریب اور شاہ وگدا کا امتیاز نہیں، بلکہ جو شخص بھی اس کی قدر کرے گا اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ خوشبو اسے حاصل ہوگی یہ الگ بات ہے کہ اگر پوری خوشبو حاصل نہیں ہوئی تو کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوگی اور پھر وہ خوشبو اس کی زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرے گی اور اس کے بعد اس کو ہر وہ چیز حاصل ہوگی جو ایک انسان کے لئے ضروری اور لازم ہے نیز وہ خوشبو اس کی اخروی زندگی کو بھی تابناک بنائے گی۔

اسی دین تعلیم کی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہمارے وقت شناس اسلاف اور اکابر حضرات نے ''مدارس اسلامیہ'' کے قیام کا سلسلہ جاری فرمایا جو آج تک جاری ہے، یہ مدارس! مسلمانوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ مدارس! اسلامی چھاؤنیاں اور قلعے ہیں جہاں اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب وتمدن کا تحفظ ہوتا ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے اسلامی علوم کی شعائیں پھوٹ کر پوری دنیا میں پھیلتی ہیں۔ اس بات میں مبالغہ آمیزی نہ ہوگی کہ ماضی میں صورت حال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ اگر ہمارے اسلاف مدارس کے قیام کا سلسلہ جاری نہیں فرماتے تو آج ہمارے پاس اسلامی علوم کا فقدان ہوتا۔ اور خدا کی قسم آج ہم مومن نہیں ہوتے اس لئے کہ جب مصر میں عیسائی برسرپیکار تھے تو وہاں عیسائیوں نے مدارس کی تعلیم پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان امن وسکون اور صلح وآشتی کا گہوارہ کیسے قائم ہوسکتا ہے؟ جبکہ ہمارے خلاف تمہارے قرآن میں نفرت آمیز باتیں کہی گئی ہیں اس لئے تم ان نفرت آمیز آیتوں کو (نعوذ باللہ) قرآن سے نکال دو اور اس طرح ایمان کا سودا کرنا شروع کر دیا چنانچہ ایک ایسا دور آیا کہ مدارس میں السلام علیکم کے بجائے و اصبا حاہ کے الفاظ کہے جانے لگے، وضو کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار خیال کیا جانے لگا۔ یہی سب کچھ ہمارے مادر وطن میں بھی ہونے والا تھا کہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے اور ہمارے وقت شناس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور پھر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مدارس کا ایسا جال بچھا دیا کہ ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور اس طرح اللہ رب العزت نے ہمارے ایمان کے تحفظ کا سامان مہیا کیا۔

یہ مدارس اسلامیہ دراصل مسلمانوں کے ایمان کے لئے پناہ گاہ ہیں اور یہیں سے اس کی حفاظت و صیانت کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے یہاں سے باطل کے اعتراضات کے جوابات دیئے جاتے ہیں اور اس کے لئے مبلغ و مصلح اور مفکر و متکلم تیار کئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب اٹھارہویں صدی میں انگریز ہندوستان کے تخت کے مالک بن بیٹھے تو سب سے پہلے انہوں نے مدارس ہی کو نشانہ بنایا اور ان کو ختم کرنا شروع کردیا۔ دہلی شہر جو اسلامی علوم وفنون کا مرکز تھا اور جہاں تقریباً ڈیڑھ ہزار مدارس تھے ان سب کو انگریز نے منہدم کر دیا اور آج بھی جو مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا جارہا ہے وہ بھی انہی شیطانی سازشوں کا نتیجہ ہے۔حتی کہ شہر حیدرآباد جو علوم و فنون کا شہر تھا جو ہندوستان کا قرطبہ اور بغداد سے جانا جاتا تھا یہ شیطانی سازش یہاں بھی آدھمکی اور دارالعلوم حیدرآباد (جامعہ عثمانیہ) جو خالص اسلامی درسگاہ تھی، بتدریج وہ عصری درسگاہ میں تبدیل کر دی گئی اور آج برائے نام اسلامیات کا شعبہ جامعہ عثمانیہ میں قائم ہے۔

آج ملک گیر سطح پر ہندو انتہا پسند تنظیمیں یہ کوشش کر رہی ہیں کہ مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دے کر ان کو بند کر کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے اس لئے کہ جب تک ہندوستان میں یہ دینی مدارس قائم رہیں گے اس وقت تک ان کے مقاصد وعزائم کی تکمیل نہیں ہو پائے گی اور ان کا مشن کامیاب نہیں ہوسکے گا یہی وجہ ہے کہ آج کے مسلم دشمن سازشی بار بار یہ آواز اٹھا رہی ہیں کہ ملک کے تقریباً ۲۵ ہزار مدارس کو بند کیا جائے ۔کتنی افسوس کی بات ہے کہ اس کے باوجود مسلمانان ہند بے خبری کی نیند سو رہے ہیں اور وہ اپنی ہلاکت سے بچاؤ کی تدبیریں کرنے سے قاصر نظر آرہے ہیں آخر وہ کون سی صبح ہوگی کہ مسلمان بیدار ہوں گے؟ کیا ان کے بیدار ہونے کا وقت نہیں آیا؟ کیا انہیں اس بات کا انتظار ہے کہ پھر دوبارہ گجرات جیسی نسل کشی ہو؟ کیا پھر مسلمان مردوں اور عورتوں کو نذر آتش کیا جائے؟ آخر انہیں کس بات کا انتظار ہے؟۔

جب تک یہ دینی مدارس قائم و دائم اور باقی رہیں گے اس وقت تک مسلمانوں کی جان و مال اور ایمان کا تحفظ ہوگا اور اس وقت تک آپ ایمان کے ساتھ مسلمان بن کر ہندوستان میں زندگی گذار سکیں گے اور جب یہ مدارس ختم کر دیئے جائیں گے (اللہ کرے ایسا نہ ہو) تو اس وقت آپ کا مسلمان بن کر ایمان کے ساتھ ہندوستان میں رہنا مشکل ہی نہیں، دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن اور محال ہو جائے گا اس لئے کہ اگر مسلمانوں کے پاس کوئی لشکر اور فوج ہے تو وہ یہی طالبان علوم نبوت کی

جماعت ہے جس نے ہر دور اور ہر زمانے میں باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور جس سے آج پوری دنیا خائف و پریشان نظر آرہی ہے۔

ان مدارس اسلامیہ میں دہشت گردی کی نہیں بلکہ دین اسلام اور مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہاں انسانیت کا درس دیا جاتا ہے۔اور یہ سبق پڑھایا جاتا ہے ''مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا'' (المائدۃ:۳۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی نے کسی نفس کو بغیر نفس کے یا زمین میں فساد برپا کئے بغیر مارا تو گویا کہ انہوں نے تمام انسانوں کو مارا اور جس نے ایک جان کو زندگی عطا کی تو گویا کہ اس نے تمام انسانوں کو زندگی عطا کی۔

اور مدارس میں ''ایذا مرداں حرام است'' (یعنی لوگوں کو تکلیف پہونچانا حرام ہے) کی تعلیم دی جاتی ہے پھر یہاں دہشت گردی کا کیا سوال؟ کیا یہی تعلیم دہشت گردی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ مدارس پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام دراصل سوچی سمجھی سازش ہے اور وہ اس کے تحت مدارس کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کے بعد مسلمانان ہند بے آب و گیاہ رہ جائیں گے اور ان کو ختم کرنا آسان ہی نہیں بلکہ ایک طفلانہ کھیل ہو جائے گا لہذا اگر آپ کو دین اسلام اور اس کی تعلیم سے محبت ہے تو ان مدارس اسلامیہ کا ہر ممکن تحفظ کریں اور ان کی خاطر اپنی جان و مال کی قربانی پیش کریں، اگر آپ کو ان قربانیوں کا فائدہ نہیں حاصل ہوا تو آپ کی اولاد ضرور اس سے فائدہ حاصل کرے گی۔

(۲۲ر شوال المکرم ۱۴۲۳ھ)

***

دینی گرمائی کلاسس کا اختتام اور آئندہ کا لائحۂ عمل

اسلام کی بنیادی اور ضروری علم بالخصوص عقائد اور ضروریاتِ زندگی سے متعلق اسلامی معلومات حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے'' اسی پس منظر میں اسکول وکالجس میں عصری علوم حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے گرمائی تعطیلات کے موقع پر شہر کے مختلف کمیٹی اور اداروں نے دینی تعلیم کے لئے گرمائی کلاسس کا مناسب انتظام کیا اور اس کو انتظامیہ نے انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام تک پہونچایا اور اس سے استفادہ کرنے والے طلبہ کو توصیفی سند بھی دی، یہ ایک قابلِ ستائش عمل تھا، جس کے لئے اس کے انتظامیہ قابلِ مبارکباد ہیں اور دعاء ہے کہ اللہ رب العزت ان کو دونوں جہاں میں عزت وکامیابی عطا فرمائے۔

اس گرمائی کلاسس سے مختلف اسکول وکالجس کے بہت سارے طلبہ عزیز نے استفادہ کیا اور دینی تعلیم کے مختلف علوم کو اختصاراً حاصل کیا، ان علوم میں قرآن، مخصوص سورہ کا ترجمہ، حدیث اور نبی رحمت ﷺ کی سیرت مبارکہ خصوصی طور پر شامل نصاب تھی، گویا کہ یہ گرمائی کلاسس جس مقصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، وہ عصری علوم حاصل کرنے والے طلبہ کے اندر دینی بیداری، قرآنی احکام کی جان کاری، سنت سے آگہی اور سیرت مبارکہ سے واقفیت ہے اور ان کے اندر اس بات کا شعور پیدا کرنا ہے کہ ان کا مقصد زندگی کیا ہے؟ اور وہ اس دنیا میں کیوں پیدا کئے گئے ہیں؟ ان سب معلومات کے لئے یہ گرمائی کلاسس قائم کئے جاتے ہیں اور اس کے خاطر خواہ فوائد بھی سامنے آتے ہیں۔

اب جب کہ گرمائی کلاسس اختتام کو پہونچ چکا ہے اور طلبہ کی تعطیلات بھی ختم ہو چکی ہیں اور پھر وہ اپنے تعلیمی سفر کو شروع کرنے والے ہیں، تو اب ان کو آئندہ کیا کرنا چاہئے؟ کیسے رہنا چاہئے؟ یہ ایک

انتہائی اہم مسئلہ ہے، تو اس سلسلے میں چند مشورے پیش کئے جا رہے ہیں، تا کہ وہ ان کو اختیار کر کے اور ان پر عمل کر کے مزید اپنی دینی تعلیم کو اضافہ کر سکیں اور اس کو پائیدار بنا سکیں۔

○ سب سے پہلے یہ کام کریں کہ وہ مطالعاتی کتابوں کی تعیین کریں اور جو آسان اور مفید معلوم ہو اس کو اپنے مطالعہ میں شامل رکھیں، اس سلسلے میں اپنے دوست واحباب اور اہلِ علم حضرات سے مشورہ بھی کریں اور ان سے معلوم کریں کہ ہمارے مطالعہ کے لئے فلاں موضوع پر کون سی کتاب زیادہ مناسب ہوگی، اس کے بعد وہ جو مشورہ دیں اس پر اپنی عقل وفہم سے سنجیدگی کے ساتھ خوب غور وفکر کریں، پھر اگر اس مشورہ کی روشنی میں وہ متعین کردہ کتاب مناسب معلوم ہو، تو اس کو اپنے مطالعہ میں شامل کرلیں، ورنہ تو پھر انہی سے یا پھر کسی دوسرے حضرات سے دوبارہ مشورہ کریں اور اس طرح اپنی مطالعاتی کتابوں کی تعیین کریں، تو اُمید قوی ہے کہ ان کا یہ عمل، یہ ذوقِ مطالعہ، یہ دینی رجحان اور دینی حمیت انشاء اللہ نتیجہ خیز، مفید اور کارآمد ثابت ہوگی اور وہ اس طرح دینی علوم کے بہت سارے معلومات کو آسانی کے ساتھ حاصل کرسکیں گے۔

○ کتابوں کی تعیین کے سلسلے میں جہاں تک میری رائے اور مشورہ ہے، تو ایسے طلبۂ عزیز کے لئے چند مفید، مختصر اور جامع کتابوں کی رہنمائی کی جاتی ہے، ترجمہ کلام پاک کے لئے ''ترجمہ شیخ الہند'' سب سے زیادہ مناسب ترجمہ ہے، حدیث کے موضوع پر ''ریاض الصالحین مترجم'' اور سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر مفکرِ اسلام سید ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ کی کتاب ''نبی رحمت'' زیادہ موزوں ہے، ان تین کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں، اگر شرعی مسائل کی کتاب بھی شامل مطالعہ کرنا چاہیں، تو اس موضوع پر سب سے زیادہ بہترین کتاب حضرت مولانا مفتی اعظم محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تعلیم الاسلام مکمل'' ہے، اس کتاب میں فقہی اور شرعی مسائل کو سوال و جواب کے آئینہ میں بہت ہی مختصر اور جامع انداز میں تحریر کی گئی ہے۔

○ جب کتابوں کی تعیین کرلیں، تو اس کے بعد سب سے پہلا کام یہ کریں کہ وہ اپنے پورے دن (تعلیمی اوقات کے علاوہ) کا خاکہ تیار کریں اور دیکھیں کہ وہ کس وقت کیا کرتے ہیں اور پھر تمام پہلوؤں مثلاً کھانا، پینا، سونا، گھر کے دیگر امور کی انجام دہی، اپنی ضروریات سے فراغت، دوست واحباب کے ساتھ سیر وتفریح اور ہنسی مذاق کو سامنے رکھیں، پھر اپنے خارجی مطالعہ کے لئے ایک مناسب وقت نکالیں، خواہ وہ وقت مختصر ہی کیوں نہ ہو، مثلاً آدھ گھنٹہ، بیس منٹ وغیرہ اور یہ ایسا وقت ہو جس میں ان کو

مطالعہ کرنے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ مانع اور حائل نہ ہو اور وہ اس وقت کوئی دوسرا کام نہ کریں اور نہ دوسرے امور کی طرف توجہ کریں، بلکہ ہر چیز سے اس وقت کو فارغ کر لیں اور پوری تندہی کے ساتھ مطالعہ میں مشغول ہو جائیں اور ہر چیز کو سمجھ سمجھ کر پڑھیں اور مطالعہ کے دوران جو سمجھ میں نہ آئے اسے ایک نوٹ بک میں لکھ لیں، پھر اپنے کسی قریبی یا محلّہ کے کسی عالم صاحب سے اس کے متعلق دریافت کرلیں اور بغیر سمجھے اس کو نہ چھوڑیں۔

○ اپنے مطالعہ کو جاری رکھنے کے علاوہ اہلِ علم اور علماء طبقہ سے اپنا تعلق و ربط قائم کریں، جو دینی لحاظ سے قابلِ اعتماد اور باعمل ہوں اور ان سے برابر ملتے جلتے رہیں اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مطالعہ کے دوران جو کچھ سمجھ میں نہ آئے یا ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو، تو اس کے متعلق ان سے دریافت کرسکیں گے اور ان سے اپنے ذہن و دماغ میں پیدا شدہ سوال اور اعتراض کو صاف کرسکیں گے، اس طرح آپ کے مطالعہ میں مزید اضافہ ہوگا، جو علماء سے ربط و تعلق کا سب سے بڑا فائدہ ہے، اس کے علاوہ باعمل اور دیندار علماء سے صرف ربط و تعلق بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، مشہور مقولہ ہے، کہ ’’ نیک آدمی کی صحبت آدمی کو نیک بنا دیتی ہے‘‘ اور اس سے انسان کے اندر دینداری، دنیا سے بے تعلقی اور خدا سے قربت بڑھتی ہے، غرض کہ ربطِ علماء کسی بھی حال میں فائدہ سے خالی نہیں ہے، چاہے دنیوی فائدے ہوں یا اُخروی بہر حال فائدے تو ضرور ہوں گے۔

○ اس کے علاوہ دوسری طرف دینی اجتماع اور جلسہ وغیرہ میں بالالتزام شرکت کیا کریں اور اجتماع کے دوران خطباء کے بیان اور ان کی بات کو غور سے خوب دھیان لگا کر اور ذہن و دماغ کو حاضر رکھ کر سنیں اور عمل کی نیت سے سنیں نہ کہ بس یوں ہی تفریحاً، اور اس بات کی طرف قطعی توجہ نہ کریں کہ یہ کہنے والا کیسا ہے، اچھا ہے یا بُرا، یہ اپنی اس بات پر عامل ہے کہ نہیں یا یہ صرف دوسروں سے یہ بات کہہ رہا ہے اور اپنے آپ کو اس سے غفلت میں ڈالے رکھا ہے، ان سب باتوں کی طرف توجہ نہ کریں، عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ: ترجمہ ’’انسان اس کی طرف دیکھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے نہ یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے‘‘ اور اس کا کہنے والا کیسا ہے، جب آدمی کسی بات کو اس طرح سنے گا تو وہ بات اس کے لئے فائدہ مند ہوگی اور اس کے لئے کار آمد ثابت ہوگی اور انشاء اللہ دین میں مزید پختگی اور استقامت پیدا ہوگی اور انابت الٰہی میں اضافہ ہوگا۔

○ یہ تمام کام کرتے ہوئے پہلے اپنی نیت و ارادے کو درست کر لیں اور اپنے اندر اخلاص ضرور پیدا

کریں، اس لئے کہ تمام کاموں کے نتائج وثمرات کا دار و مدار نیتوں پر ہے، اللہ کے رسول نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انما الاعمال بالنیة'' (بخاری ومسلم) کہ تمام ہی اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے، جیسی نیت ہوگی، ویسے ہی اعمال کے نتائج وثمرات برآمد ہوں گے، مشہور اردو محاورہ شعری انداز میں ہے

جیسی کرنی ویسی بھرنی ، نہ مانے تو کر کے دیکھ
جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مر کے دیکھ

یعنی کوئی کام جس نیت وارادے کی بناء پر انجام پذیر ہوگا، اس کے نتائج بھی اسی طرح سامنے آئیں گے، ایسا نہیں ہوگا کہ کوئی منافق ریاء کے لئے نماز پڑھے اور عند اللہ وہ ماجور ہو، ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے ان سب کام کے کرنے سے پہلے نیت کی درستگی کرلیں تو یقیناً اس مقصد میں کامیابی ہوگی اور ایسا نہیں ہوگا کہ محنت تو سارے کرلیں اور اس کا فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہو۔

یہ چند مشورے بنیت خیر خواہی قلمبند کئے گئے، امید کہ اسکول وکالجس کے مسلم طلبہ ان پر عمل کر کے اپنی آخرت کو بنائیں گے۔

(۵ رربیع الثانی ۱۴۲۴ھ)

عصری علوم مسلمانوں کا گمشدہ خزانہ

دینی درسگاہوں میں عصری علوم کی ضرورت اور افادیت

مدارسِ اسلامیہ کے آغاز کا ثبوت ابتداء اسلام سے ہی ملتا ہے، جب نبی اکرم ﷺ نے نبوت کے فریضہ کو سنبھالا اور اس کی تبلیغ شروع کی تو اس کے ساتھ ہی آپ نے نئے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دارِ ارقم کو اس کے لئے متعین کیا جب آپ نے مدینہ کی جانب ہجرت کی تو وہاں اس کے لئے مسجد نبوی کے پاس ایک چبوترہ بنوایا، اسی چبوترہ پر اپنی زندگی گذر بسر کرنے والے اصحافِ صفہ کہلائے اس کے بعد چوتھی صدی ہجری تک مدارس کا کام ذاتی مکان یا مساجد سے لیا جاتا رہا حتیٰ کہ ایک مسلمان بادشاہ محمود غزنوی نے مدرسہ کی سب پہلے بنیاد ڈالی اور اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ ان مدارس میں شروع ہوا۔

ابتداء میں ان مدارس میں علومِ قرآن و حدیث اور فقہ وعقائد کی تعلیم ہوتی رہی اور یہی ان کا بنیادی نصاب رہا، البتہ نحو وصرف اور دیگر علوم وفنون جو محض قرآن فہمی اور حدیث و فقہ کے سمجھنے میں لابدی ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ بھی داخل رہے، چنانچہ ان مدارس سے خالص دینی علماء رہنما اور مفکر پیدا ہوتے رہے اور تقریباً نصف صدی تک مدارس کا یہی حال رہا کہ خالص دینی علوم کی بنیاد پر یہ مدارس گامزن رہے لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ مدارس میں بھی عصری علوم کا درس ہونے لگا اور اسی کی ایک جھلک ہندوستان میں ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی اور دیگر چھوٹے بڑے مدارس ہیں حتیٰ کہ عظیم مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں بھی جدید تقاضے کے مطابق کئی ایک شعبے قائم ہیں اور آج اس کی ضرورت و افادیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

چنانچہ آج کے دور میں پھر سے مدارسِ اسلامیہ کی نصابِ تعلیم پر مقصدِ اصلی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مدارس کا پورا نصابِ تعلیم قابلِ تغیر ہے

اور ضروری ہے کہ ہم اس میں مناسب ترمیم گوارہ کریں نیز ہمیں اس حقیقت کا کھلے دل اعتراف کرنا چاہئے کہ آج ان درسگاہوں سے فضلاء کی جو کثیر تعداد نکلتی ہے اس سے یہ صورتِ حال کچھ امید افزاء نہیں ہے اور اس کی افادیت جو ہونی چاہئے اس لحاظ سے یہ تناسب مایوس کن ہے۔ (دینی مدارس اور عصر حاضر: ۲۴)

چنانچہ اس خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی اشد ضرورت ہے، قدرت کا فیصلہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت خود نہ بدل لے، لہٰذا ہندوستانی مسلمان کو اپنی حالت کا فیصلہ خود ہی کرنا ہوگا اور اس کے لئے محنت و مشقت کو اپنا زادِ سفر بنانا ہوگا اور ہماری یہ ذمہ داری ہوگی کہ ہم مسلمان بچوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی ذہنیت اور اس کے حصول کا شوق پیدا کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ عصری علوم دراصل مسلمانوں کا گمشدہ خزانہ ہے جو دوسروں نے اپنا لیا ہے اور مسلمان اس سے اس طرح غافل ہوئے کہ اس کا تعلق بھی اس سے قائم نہ رہ سکا، چنانچہ مولانا عبدالقوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی تک دنیا کے تمام مادی علوم وفنون پر مسلمان قابض رہے، کوئی بھی شخص اگر انصاف کے ساتھ تاریخ کا تجزیہ کرے گا تو تاریخ اس حقیقت سے پردہ اٹھائے گی کہ قطب نما اور بحرِ پیمائی کے موجد مسلمان تھے اور ان کے استعمال کا طریقہ انہوں نے اسلامی درسگاہوں میں سیکھا تھا، لیکن مغرب نے اس کو چھپانے کی سعی کی اور صدیوں سے وہ تاریخ کے چہرہ پر پردہ ڈالتے رہے، انہوں نے مسلمانوں کی کتابیں اپنے نام سے شائع کیں اور مسلمانوں کے کارناموں کو اصلاح وعنوان تبدیل کر کے اپنے محققین کے سر ڈالا اور یوں دھیرے دھیرے یہ بات خود مسلمانوں کے ذہن ودماغ سے اوجھل ہوگئی''۔

قرونِ وسطیٰ میں آزاد مسلم حکومتوں کے باعث مسلمانوں کی یہ علمی برتری قائم نہ رہ سکی اور علم کی یہ شمع مشرق سے مغرب منتقل ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا ایک عالمِ دین لکھتے ہیں:

> ''مسلمان تعلیمی میدان میں پسماندہ بن کر رہ گئے جس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو دینی اور دنیوی دونوں حیثیت سے سخت نقصان پہونچا اور وہ جدید علوم کی روشنی سے بھی محروم ہوگئے''۔

چنانچہ اسلام کو دینی لحاظ سے جو نا قابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ کہ مسلمانوں نے اسلامی ریسرچ کی مدد سے اللہ تعالیٰ کے نظام میں چھپے ہوئے اسرار اور نشانیوں کو واضح کر کے قرآن وسنت کی

صحیح ترجمانی اور فرقِ باطلہ کے ابطال کا فریضہ چھوڑ دیا اور مسلمانو کو دینی لحاظ سے گھاٹا یہ ہوا کہ انہوں نے ان علومِ جدیدہ کو مغربیت کا نمائندہ کہہ کر ان سے اپنا دامن چھڑا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا مسلمان ان علوم کے مادی فائدوں سے محروم ہو گیا، علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

بہت سارے مدارسِ عربیہ ایسے ہیں جن کا عصری علوم سے کوئی واسطہ نہیں وہ جغرافیہ سے نابلد ہیں۔ نہ فزکس کی معرفت ہے۔ نہ کیمیا اور علوم حقانیت کے ہی مبادیات سے واقف ہیں، انسان اگر ان اہم علوم کے مبادی سے ناواقف ہو تو وہ اس دور میں کیسے جی سکتا ہے؟ جب ہم بعض مسائل پر گفتگو کرتے ہیں جن کا تعلق عصری علوم سے ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کے فارغ التحصیل صورتِ حال کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نصوصِ دین کی طرح مسئلے کی حقیقی صورتِ حال سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو، اس لئے کہ دین اور عصرِ حاضر کے علوم میں مہارت کے بغیر صحیح فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ رویتِ ہلال کے مسئلہ سے آگاہی ممکن نہیں جب تک کہ علم فلکیات سے واقفیت نہ ہو، جب ہم نہیں جانتے کہ فلکیات کیا ہے؟ چاند گرہن اور سورج گرہن کیا ہے؟ اور شمس وقمر کی گردش کس حساب میں ہے؟ تو کیسے کوئی حتمی رائے قائم کر سکتے ہیں؟

اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی حاصل کریں اور عصری ادارے قائم کریں جن سے ہمارے معاشرے کی ضرورتیں پوری ہوں، وہ اس کے ارتقاء کے ضامن بن جائیں اور اپنا موثر اور بھرپور کردار ادا کرسکیں۔

(۱۱/ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ)

عراق کی تاریخ کا علمی مقام ومرتبہ

اسلامی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا اور عالمِ اسلام کے حدود بڑھتے گئے تو مسلمانوں نے مفتوحہ علاقوں میں کئی نئی شہر آباد کئے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے ''بادیۃ الشام'' کو فتح کیا جو سنگلاخ اور بے آب وگیاہ تھا، اس میں صرف لوگوں کی جائے پناہ اور چند وادیاں تھیں تو وہاں بھی کئی شہر آباد کئے جن میں سب سے بڑا شہر بغداد ہے جو ہزاروں سال تک اسلامی مملکت کا پایۂ تخت رہا، مسلمانوں کی فتوحات کے بعد انتظامی طور پر یہ علاقہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا اور وہ عراق کہلایا اور پھر بغداد وہاں کا پایۂ تخت بنا رہا، ملک عراق پانی کی سہولت کی وجہ سے کافی سرسبز وشاداب علاقہ ہے، اس لئے کہ دجلہ شمال مشرق سے اور فرات شمال مغرب سے عراق میں داخل ہوتا ہے (جزیرۃ العرب: ۴۹، ۵۰)

اس ملک کی قدیم تاریخ اور نئی تہذیب وتمدن رہا ہے اور یہاں چند طاقتور قوموں کا عروج و زوال بھی رونما ہوا ہے، یہ ملک نبی اکرم ﷺ سے قبل بہت سارے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا مسکن بھی رہا ہے اور ان کی قوموں کو نافرمانی اور روگردانی کی وجہ سے عذاب الٰہی کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسلوں کا قیام زیادہ تر جنوبی شام اور شمالی حجاز ہی میں رہا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ان کا خاندان عراق ہی میں رہا اور ان کا وطن شہر ''اور'' تھا جس کا جائے وقوع اب بصرہ سے کچھ فاصلے پر بتایا جاتا ہے اور زمین کھود کر اس کے کھنڈرات برآمد کر لئے گئے ہیں، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوتِ توحید کا کام کرنا شروع کیا اور ماحول نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو آپ نے وہاں کے حالات کو ناسازگار پا کر فلسطین کی جانب ہجرت فرمائی اس لحاظ سے عراق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مسکن رہ چکا ہے (جزیرۃ العرب: ۱۲۵)

بغداد شہر جو عالمِ اسلام کا دارالسلطنت تھا جو دینی علوم وفنون اور مادی وسیاسی جوہر کا منبع ومرکز تھا اور جو اسلامی علوم وفنون کی وجہ سے پوری دنیائے اسلام میں ایک خاص مقام ومرتبہ کا مالک تھا، جہاں بڑے بڑے ماہرین اور جلیل القدر علماءِ کرام اور حکمائے امت پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی علمی

صلاحیت واستعداد سے بغداد کو ناقابلِ تسخیر قوت واستعداد عطا کیا جو دوسروں کے لئے قابلِ رشک ہوئی اور ایسے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیئے جو آنے والی نسلوں کے لئے فخر وسعادت کا باعث ہیں، محمد ابوزہرہ مصری ''حیات امام احمد بن حنبل'' میں لکھتے ہیں۔

اس وقت کا بغداد ہر اعتبار سے فرد اور یگانہ تھا، ہر رنگ ہر وضع اور ہر منہاج کے لوگ وہاں موجود تھے اور ان کے الگ الگ حلقے قائم تھے، وہاں قاری اور محدث تھے، صوفیاء اور علماء تھے، ماہرین فضلائے لغت تھے، حکماء اور فلاسفہ تھے، غرض ہر گروہ، ہر طبقہ اور ہر حلقہ مسلک کے تنوع، راستے کے تعدد، مشرب کے اختلاف اور علوم کی رنگارنگی کے باوجود موجود تھا'' (حیات امام احمد بن حنبلؒ اردو: ۶۱)

''بغداد علوم مختلفہ اور متنوعہ کا مرکز ومنبع بنا ہوا تھا، علومِ دین کے علاوہ علم لغت، ریاضی، فلسفہ، تصوف غرض ہر علم وفن کے زاویے کھلے ہوئے تھے، مدارس ومکاتب موجود تھے، حلقہ ہائے درس وتعلیم قائم تھے'' (حوالہ سابق صفحہ ۶۳)

''اس زمانہ میں محدثین کرام عالمِ اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ بصرہ اور کوفہ میں بھی محدثین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور بغداد تو خلافت اسلامیہ کا پایۂ تخت اور مرکز تھا یہاں محدثین کا ایک جمِ غفیر موجود تھا، غرض یہ وہ مبارک زمانہ تھا کہ دیار وامصار میں علمائے حدیث کے گروہ اور طبقات پھیلے ہوئے تھے'' (حوالہ سابق صفحہ ۶۵، ۶۶)

ان ہی وجوہ کی بناء پر حضرت امام احمدؒ نے بغداد وکوفہ کے علاوہ بصرہ کا حصول علم حدیث کے لئے پانچ مرتبہ سفر کیا اور بعض دفعہ وہاں کئی کئی ماہ تک قیام فرمایا جہاں بعض شیوخ سے کسبِ فیض کرتے کبھی کم مدت تک کبھی زیادہ عرصہ تک جیسا موقعہ اور حالات کا تقاضہ ہوا (حوالہ سابق صفحہ ۶۹)

یہ تو بغداد کی علمی حیثیت اور اس کی تاریخ تھی، لیکن نظام قدرت بھی جس طرح کسی قوم کے عروج وزوال کا سبب بنتا ہے تو اسی طرح سے وہ علمی مرکز ومنبع کے ساتھ بھی پیش آیا اور اس کے عروج کو زوال سے بدل دیا اور اس کی مرکزیت کو یکسر ختم کر دیا، جہاں سے علم ونور کی کرنیں پوری دنیا میں پھیلتی تھی وہاں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس کا کوئی پرسان حال باقی نہیں رہا، چنانچہ جب تاتاری فتنہ کا دور آیا اور اس نے پھر ایک مرتبہ جہاں عالمِ اسلام کو نیست ونابود کرنا چاہا، وہیں اس نے بغداد کو بھی اپنے ظلم وجور کا نشانہ بنایا اور وہاں کے باشندوں کو بے دریغ قتل کیا، اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کو بھی ختم کرنا شروع کیا اور بے انتہاء کتابوں کو نذرِ آتش کیا، تاریخ میں آتا ہے کہ وہاں اتنی ساری کتابوں کو جلایا

گیا کہ اس کی راکھ سے دریائے دجلہ اور فرات کا سارا پانی سیاہ ہوگیا اور بہت دِنوں تک وہ سیاہ رہا اس طرح بغداد کا علمی مقام مرتبہ ختم ہوا اور تاریخ نے قوموں کے عروج وزوال کے ساتھ علمی عروج وزوال کو بھی دیکھا جو شاید اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہو اور وہ مشاہدہ بھی آخری مرتبہ ہو۔

عراق کی تاریخ میں ایک بڑا کارنامہ حضرت عمر فاروقؓ کا کوفہ ہے انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں کوفہ شہر کو بسایا اور بحر العلوم حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو وہاں کا معلم بنا کر بھیجا جبکہ حضرت عمرؓ کا حال یہ تھا کہ وہ تمام بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو مدینہ ہی میں اپنے پاس رکھتے تھے لیکن انہوں نے ان سب باتوں کو چھوڑ کر عبد اللہ بن مسعودؓ کو وہاں بھیجا اور جب انہوں نے کوفہ میں درس وتعلیم کا سلسلہ شروع فرمایا تو بے شمار فرزندانِ توحید ان کے اردگرد جمع ہونے لگے اور ان کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ احادیث کا مرجع بن گئے۔

حضرت علیؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اپنی خلافت کا پایۂ تخت کوفہ ہی کو بنایا اور یہ بھی علمی مقام میں فوقیت رکھتے تھے بعض علماء کا کہنا ہے کہ تمام صحابہ کرام کے علوم کا مجموعہ چھ صحابہ تھے اور ان چھ کا علم دو صحابہ میں سمٹ کر آگیا تھا اور وہ دونوں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ تھے، اس لحاظ سے صحابہ کرام کا پورا علم ان دو صحابہ کے واسطہ سے کوفہ آگیا۔

کوفہ شہر کو ایک دوسری حیثیت سے بھی برتری اور فوقیت حاصل ہے کہ صرف کوفہ میں ایک ہزار سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک صحابہ نے صرف سکونت اختیار کی تھی اور ان کے علاوہ بے شمار صحابۂ کرام یہاں آئے اور چلے گئے، مزید برآں کہ بخاری شریف کے راویوں میں سے تین سو راوی صرف کوفہ کے ہیں اور بخاری شریف وہ کتاب ہے جس کے متعلق پوری امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے۔

کوفہ شہر جو ابھی تمام شہروں میں علمی حیثیت سے فائق و برتر تھا اور وہ علوم نبوی ﷺ کا مرکز بنا ہوا تھا کہ جب امام ابو حنیفہؒ کے استاد کا انتقال ہوگیا اور ان کی وجہ سے وہ مسند درس خالی ہوگیا جس پر بیٹھ کر کبھی عبد اللہ بن مسعودؓ درس دیا کرتے تھے تو تمام کوفی اہلِ علم نے امام ابو حنیفہؒ کو مسند درس پر بٹھایا، اس طرح امام صاحب کے علم اور فضل وکمال کا سکہ کوفہ پر جم گیا اور اپنے علم سے کوفہ اور عالمِ اسلام کو سیراب کرنا شروع کیا اور ان کے ایسے ایسے شاگرد پیدا ہوئے جنہوں نے امت کے لئے ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا جس کو دنیا کبھی بھول نہیں سکتی ہے۔

(۱؍ صفر المظفر ۱۴۲۴ھ)

واقعۂ کربلا اور اس کے نصائح

جمعہ کا دن ہے، عالم اسلام کے کونے کونے میں خطبے ختم ہو چکے ہیں نمازیں پڑھی جا چکی ہیں، اس وقت سے چند ساعت قبل پوری دنیائے اسلام کی مساجد میں نبی آخر الزماں ﷺ کا اسم مبارک گونج رہا تھا اور اسی کے بعد اسی نبی ﷺ کے نواسے ان کے پیارے ان کے لخت جگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ میدانِ کربلا میں شہید کئے جا رہے ہیں عمر و سعد اور اس کی فوج مارے خوشی کے اچھل کود رہی ہے۔ واقعہ کربلا ذاتی مفاد اور ہوس جاہ کی وجہ سے پیش آیا ہے اور اس کا دوسرا پہلو کلمہ حق کے احیاء اور اسلامی نظام حکومت کو باقی رکھنے سے متعلق ہے اور یہی وہ بنیادی اور اصولی فرق تھا جس کی بنا پر ایک جماعت زندہ جاوید ہوگئی اور دنیائے اسلام ان کی معتقد اور مؤید ہوگئی اور دوسری جماعت سے اہلِ حق نے اپنی برأت کا اظہار کیا اور ان سے دستبرداری اختیار کر لی۔

اب تاریخ پر نظر ڈالئے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزیدی فوج نے آپ کے اصحاب سمیت شہید کر دیا جبکہ یزید نے قتل کے بجائے ان کی گرفتاری کا حکم دیا تھا لیکن جب ان کا سر یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے قاتلین حسینؓ کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی اس پر حد یہ کہ اس نے جناب زینبؓ بنت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا یہ اس کی بغاوت کی سزا ہے اس کے بعد ایک چھڑی سے سرِ حسینؓ سے بدتمیزی کی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے قاتلین حسینؓ کے لئے انعام کا حکم بھی جاری کر دیا جس سے پتہ چلتا ہے یزید شہادتِ حسینؓ سے خوش تھا۔ اس واقعہ کربلا سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ایک نواسہ رسول ﷺ کا لحاظ نہیں رکھا۔ مزید برآں وہ اہلِ بیت کے ساتھ بدتمیزی کا مرتکب ہوا وہ اس طور پر کہ اس نے خاندان رسالت کو تکلیف پہونچائی جب زینبؓ حضرت زین العابدینؒ کے ساتھ گرفتار کر لی گئی تو اس کے بعد ان کو رسی باندھی گئی سر سے روا چھین لی گئی۔

اس واقعہ کربلا سے ہمیں اولاً یہ درس ملتا ہے کہ جب ہم کسی کام کا ارادہ کریں اور وہ جائز ہو تو اس

کو ضرور پورا کریں، ایسی خبر پر کوئی توجہ نہ دیں جو حارج قصد و ارادہ ہو جب کوئی کسی کو قتل کرنا چاہے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ مجھے چھوڑ دو میں لڑائی کرنا نہیں چاہتا، اپنے اہل وعیال اور اصحاب کے لئے جان قربان کر دینی چاہئے، پیاسے کو پانی سے نہیں روکنا چاہئے اگر چہ وہ دشمن ہوں جب کوئی قتل کے درپے ہو تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے اسی طرح اگر کوئی اپنے کو حق پر سمجھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ باطل کا اپنے آخری سانس تک صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرے۔

کوئی بھی قصد و ارادہ ہو تو اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو ناجائز اور حرام ہے تو اس کو انجام دینا اور پورا کرنا حرام ہے اور ایسے کام سے اجتناب واحتراز واجب ہے البتہ دوسری قسم جو جائز ہے تو اس کی تکمیل بھی جائز اور مباح ہے اس کو مکمل کر ہی لینا چاہئے قرآن وحدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہے ''پس جب آپ کسی کام کا مکمل ارادہ کر لیں تو اس کو اللہ کے اوپر بھروسہ کر کے شروع کر دیں'' (آل عمران: ۱۵۹) اور دوسری جگہ ہے اپنے اعمال کو باطل یعنی رائیگاں مت کرو اس لئے کہ کسی فعل اور عمل کو وجود میں لا کر برباد کرنا عقلمندی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر طرح سے قابل مذمت ہے اور نیت و ارادہ کر لینا کسی شرعی فعل کا عمل کے درجے میں ہے اس لئے کہ اس نیت و ارادے پر اللہ کی جانب سے ثواب کا مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لہٰذا اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر جائز اور مباح قصد و ارادہ کو تکمیل تک پہونچا ہی دینا چاہئے بشرطیکہ وہ جائز قصد کسی شرعی امور یا دوسرے معاملہ میں دخل انداز اور حارج نہ ہو۔

جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ کے سفر پر روانہ ہوئے تو راستہ میں مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر دی گئی اور ساتھ ہی وہاں کے حالات سے واقفیت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دیا گیا تو آپ نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور آگے اپنے سفر کو یہ کہتے ہوئے جاری رکھا کہ ''جو پیر اللہ کے راستہ میں نکل چکا ہے وہ اب کسی بھی حالت میں پیچھے نہیں لوٹ سکتا ہے'' اس لئے کہ یہ خبر آپ کے قصد و ارادہ اور تکمیل احکام میں حارج بن رہی تھی اور اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب ہم کسی کام کا عزم مصمم کریں تو اس کو پایہ تکمیل تک پہونچا کر سانس لیں۔

اس سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جب کوئی کسی مسلمان کے قتل کے درپے ہو تو اس سے کہہ دیا جائے کہ مجھے چھوڑ دو میں قتل و قتال کرنا نہیں چاہتا لیکن جب وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو پھر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے اور صبر و استقامت کا بھرپور ثبوت دینا چاہئے اس لئے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے

اولاً ان سے کہا کہ مجھے چھوڑ دو اور جب وہ اس پر تیار نہ ہوئے تب آپ نے یزیدی فوج کا اپنی زندگی کے آخری سانس تک مقابلہ کیا اور صبر و استقامت کے ساتھ جم کر لڑتے رہے ان کے سامنے ان کے اہل خاندان، اہل وعیال اور ان کے تمام اصحاب شہید کر دیئے گئے لیکن ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی اور آپ نے حق سے ہٹ کر محض معمولی دنیا کے واسطے باطل کی بیعت نہیں کی، اس لئے کہ آپ کو یقین تھا اور یہ یقین برحق بھی تھا کہ یزیدی حکومت بادشاہی حکومت ہے جو سراسر اسلامی نظام کے مغائر ہے، اگر میں اس کی بیعت کرتا ہوں تو پوری دنیا یہ تاثر لے گی کہ یہ بھی حق ہے اور اس کی بھی کچھ حقیقت ہے اور اس طرح ملوکیت کا رواج عام ہو جاتا اور خلافت کا سلسلہ ختم ہو کر ملوکیت میں بدل جاتا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حق کی خاطر جان قربان کرنا تو گوارہ کیا لیکن یزید کی باطل بادشاہی حکومت کے سامنے جھکے نہیں اور رہتی دنیا تک کے لئے یہ درسِ عبرت دے گئے کہ حالات کیسے بھی ہوں زمانہ نامناسب ہی سہی لیکن باطل کے سامنے جھکنا نہیں چاہئے اور جو حق پر ہو اس کو چاہئے کہ وہ باطل کے نرغے میں نہ آئے اس لئے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کس کے لئے دنیا تنگ ہو سکتی ہے تین دن سے بھوکے اور پیاسے ہیں دریائے فرات پر یزیدی فوج کا قبضہ ہے اس کے علاوہ دشمن کی جانب سے بیعت کی شرط پر بے انتہاء انعام واکرام اور اعزاز کا وعدہ ہے لیکن آپ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

جب یزیدی فوج نے حضرت حسینؓ کو ان کے اصحاب سمیت ختم کر دیا اور اس کے بعد انہوں نے امام زین العابدین اور خاندان اہلِ بیت کی خواتین اور بچوں کو گرفتار کر کے انہیں قید کیا تو ان تمام مصائب کے باوجود زینبؓ ان ظالموں کے سامنے جھکی نہیں ان سے عفو کی درخواست نہیں کی بلکہ وہ ایسی حالت میں بھی حق بات کہنے سے نہیں ہچکچائیں اور کہا ”میں جانتی ہوں کہ ایمان وانصاف دربارِ یزید سے رخصت ہو چکے کہ ابن زیاد جیسا روسیاہ اور تجھ جیسا سنگدل مخلوقِ خدا کے حاکم ہوئے“ بنت مسلمؓ بن عقیل نے امام حسینؓ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے پر خولی کو ڈانٹتے ہوئے کہا ”زبان روک ایسی گستاخی نہ کر زمین تجھ کو نگل جائے“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق بات کو کہنے سے ظالم سے ظالم حاکم کے سامنے بھی نہیں چوکتے تھے اس سے آج کے مسلمانوں کے لئے درس حاصل کرنے کا مقام ہے کہ حق بات ہر کسی کے سامنے کہہ دی جائے خواہ مخاطب حاکم ہو یا بادشاہ وقت نبی اکرم ﷺ نے اسی کو افضل الجہاد سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت حسینؓ اور ان کے اصحاب کا ناحق خون میدانِ کربلا میں بہہ چکا مگر اس کے اثرات کا مرتب ہونا بھی باقی ہے قیصر یزیدی میں فتح ونصرت کے شادیانے بج چکے مگر ابھی ان محلات کا غم خانہ میں بدلنا باقی ہے جس حکومت کے واسطے حسینی خون بہایا گیا اس کو خود معاویہ بن یزید نے یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ ''خدا اس سلطنت سے مجھے محفوظ رکھے جس کی بنیاد سبطِ رسول ﷺ کے خون پر رکھی گئی ہو۔''

اب نظامِ قدرت اپنا کام اس طرح کرتا ہے کہ مختار عبید ثقفی ایک بے بس قیدی قید خانے سے حسینؓ کی حمایت لے کر اٹھتا ہے پوری دنیا اس کا مضحکہ اڑاتی ہے لیکن قدرت اپنا دست شفقت ان پر رکھتی ہے اور ان کو کوفہ کا حاکم بنا دیتی ہے ان کا سب سے پہلا فرمان جاری ہوتا ہے کہ '' قاتلین حسین قتل کے لئے حاضر ہو جائیں۔''

نمازِ فجر کے بعد مختار کا اعلان ہوا اور قیس طبران، بشیر، اسود اور عمرو بن الحجاج حاضر کر دیئے گئے ابھی ان کا قصہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دوسری جماعت حاضر ہوئی جن کا سردار ضریح بن ازور تھا ان سب کو بھی جلاد نے سسکا سسکا کر قتل کیا اس کے بعد فرار ہونے والے شمر ذی الجوشن کو تہہ خانہ سے، عمرو سعد کو پہاڑی کی کھوسے اور خولی کو جنگل سے گرفتار کر کے لائے اور ان کا بھی خاتمہ کر دیا گیا اور آخر میں عبیداللہ بن زیاد کو اس کے اوپر چڑھائی کر کے قتل کیا۔ اور اس طرح قہرِ خداوندی مختار کی صورت میں ان پر نازل ہوا، اس سے بھی مسلمانوں کو درسِ عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ ظلم وستم کے ایام تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور پھر اس کی جگہ عدل و انصاف عام ہوتا ہے لہٰذا اگر آج کے مسلمان ہر طرف ظلم وتشدد کا نشانہ بنائے جا رہے ہوں تو چاہئے کہ وہ اس پر صبر کریں تو اس ظلم وتشدد کا خاتمہ ہوگا اور انصاف ملے گا۔

(۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۴ھ)

سالِ نو کا پیغام

ہم اپنے ماضی کی زندگی کا احتساب کریں

اللہ تعالیٰ سورہ یٰس میں ارشاد فرماتا ہے کہ سورج اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اسی طرح سے چاند کے لئے ہم نے اس کے ٹھکانے کو متعین کر دیا ہے اور وہ تمام کے تمام آسمان میں تیر رہے ہیں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے ''اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو ٹھیک پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور چاند، سورج کو مسخر کر دیا ہے وہ تمام اپنے متعینہ وقت کے لئے رواں دواں ہیں'' (الزمر: ۵)

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو وجود بخشنے کے بعد اس کو بھی حرکت میں لگا دیا اور وہ بھی برابر اپنا سفر طے کرنے میں مصروف ہے اور دنیا کی ساری مخلوقات خواہ وہ ناطق ہو یا غیر ناطق اور خواہ وہ شجر و حجر ہو یا ذرات وغیرہ الغرض دنیا کی ساری چیزیں اپنا سفر طے کرنے میں منہمک اور مشغول ہیں اور اس سے کسی کو بھی چھٹکارہ نہیں ہے حتیٰ کہ ہمارا ایک ایک لمحہ بھی گذرتا جا رہا ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور دن، رات، ہفتہ، مہینہ، سال حتیٰ کہ ہماری عمریں بغیر کچھ سوچے اور بغیر کچھ تقدیم و تاخیر کے گذرتی جا رہی ہیں اور وہ کسی کا بھی خیال نہیں کرتیں نہ امیر و غریب کا، نہ حاکم و محکوم کا اور نہ ہی خدا کے فرمان اور نافرمان بندے کا ان کو ان سب سے کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہیں ہے اور وہ اس کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کرتی۔ لیکن ہر گذرا ہوا لمحہ یا رات و دن اسی طرح سے مہینہ اور سال انسان کے لئے درس عبرت و موعظمت ہے اور وہ اس کی ذہنی تربیت اور فکری عقدہ کشائیاں کرتا ہے اور وہ زندگی گذارنے کا سنہرا اصول ہے اور انسان اس کے آئینے میں اپنی گذری ہوئی زندگی اور گذرے ہوئے لمحات کا محاسبہ کر کے اپنے مستقبل کی زندگی تابناک اور منور بنا سکتا ہے گویا کہ یہ گذرے ہوئے لمحات اس کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہے اور وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کی زندگی سدھار اور سنوار سکتا ہے لیکن اس کے لئے

ایک نئے عزم وحوصلہ اور قوت وارادے کی ضرورت پڑے گی اور اس کے لئے جواں مردی کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور وقت کی قدر و قیمت پہچاننی ہوگی اور سب سے اہم یہ کہ اس کے لئے ہمیں اپنے ماضی کا محاسبہ کرنا ہوگا تب ہم کسی عزم وحوصلے کے ساتھ آگے کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں اور کامیابی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔

سہ شنبہ کی شب گھڑی کی سوئیاں بارہ نمبر پر آئیں اور بارہ کا گھنٹہ لگا کہ چہار شنبہ سے سال ۲۰۰۳ء کا آغاز ہوگیا اور اس نے ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنے نئے سفر کی ابتداء کردی اللہ کرے کہ یہ سال نو تمام عالم انسانی کے لئے مبارک ہو اور یہ سال خیر و عافیت، امن وسکون اور صلح وآشتی کے ساتھ گذرے اور بین الاقوامی اور عالمی سطح پر اتحاد واتفاق اور مساوات و بھائی چارگی کے لئے اقدامی سال ہو اور قومی، ملی، دینی اور ملکی ترقی کا باعث ہو اور ایسا نہ ہو کہ یہ سال نو فرقہ وارانہ فساد و بگاڑ، آپسی ریشہ دوانیوں، مذہبی، مسلکی اور فروعی اختلاف ونزاع، مذہبی تنازع، سیاسی جنگ وجدال، ایک دوسرے سے عداوت ودشمنی اور بغض وعناد کا سال ہو اور اگر ایسا ہی ہوا تو اس سے ہمارا ہی نقصان ہوگا، ہماری ہی ترقی کے راستے مسدود ہونگے، ہماری ہی جانیں تلف اور ہلاک و برباد ہوں گی، ہماری ہی بدنامی ہوگی اور ہم ہی دنیا کے سامنے مقہور ومظلوم ٹھہریں گے اس لئے ہمیں سوچ سوچ کر اور پھوک پھوک کر قدم اٹھانا ہوگا اور ہم جو بھی کام کریں اس سے پہلے اس کے انجام کو ہزار بار سوچ لیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور اس کے کیا ثمرات برآمد ہوں گے اس کے بعد ہی ہم کسی کام کا آغاز کریں۔ ہم اس سال کو لہو ولعب اور فضولیات ولغویات میں صرف نہ کریں اس لئے کہ وقت ایسی روٹھنے والی قیمتی چیز ہے جو گذر جانے اور ختم ہونے کے بعد دوبارہ انسان کے ہاتھ نہیں آتی اور پیچھے مڑ کر دیکھنا اس کی عادت بھی نہیں ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' لہٰذا اس کی قدر کرنے ہی سے انسان کامیاب ہوسکتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جنہوں نے بھی اس کی قدر کی اور اس کو کام میں لگایا وہ کامیاب ہوئے اور وہ بہترین انسان کہلائے اور وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ جاوید ہوگئے۔

وقت کی اہمیت!

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنا سفر نامہ مصر وشام میں لکھا ہے کہ ایک انگریز مصنف آرنلڈ کشتی کے سفر میں ہمارے ساتھ تھے کہ اچانک کشتی والوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ کشتی غرق ہونے والی ہے اس لئے سب اپنا اپنا انجام سوچ لیں جس کی وجہ سے تمام مسافرین رونے دھونے لگے اور وہ ہمارا انگریز

ساتھی لکھنے میں منہمک تھا تو میں نے تعجب سے پوچھا کہ سب پریشان ہیں اور میں آپ کو بالکل اطمینان سے لکھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ کشتی غرق ہونے والی ہے تو میں نے سوچا کہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات کو ضائع اور برباد کیوں کروں؟ چلو اس کو بھی تو کام میں لگالوں۔
(وقت ایک دولت ہے از مجیب اللہ ندوی)

اسی طرح سے وقت کی اہمیت کا اندازہ ابراہیم جلیس کے اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ لندن میں اپنے ایک دوست کے گھر دعوت پر گئے تو مہمان نواز نے ان سے مشرقی ممالک کے حالات دریافت کئے اور اس کے جواب دینے میں ان کو بیس منٹ کا وقت لگا اور اس کے بعد وہ دوست اپنا کام پر چلا گیا تو اس کی بیوی نے ابراہیم جلیس کو بیس ڈالر یہ کہتے ہوئے دیا کہ ہم نے آپ کا بیس منٹ لیا ہے جس کی ہم آپ کو اجرت دے رہے ہیں (وقت کی قیمت پہچان از محمد رضوان القاسمی)

ان واقعات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کیا چیز ہے؟ اور وقت سے کس کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور یوروپ اور مغرب نے اس کی قدر کی اور اس کو کام میں لگایا تو وہ برابر ترقی کی راہ پر گامزن رہا اور وہ برابر ترقی کرتا جارہا ہے لیکن ہم مسلمانوں نے وقت کی قدرو قیمت نہیں پہچانی اور اس کی حیثیت کو نہیں سمجھا اور لہو ولعب اور لغویات کو اپنی زندگی کا مصروف کار بنائے رکھا اور وقت کو ضائع اور برباد کردیا جس کی وجہ سے آج دنیا کے سامنے ہمارا کچھ بھی مقام و مرتبہ نہیں ہے اگر ہم دفتری آدمی ہیں تو ہم وقت کی پابندی نہیں کرتے، اگر ہم کسی کے ملازم ہیں تو وقت کی پابندی ہمارے اندر نہیں اور اگر ہم طلباء کی جماعت ہیں تو بھی وقت کی قدرو قیمت اور اس کی پابندی ہمارے اندر نہیں الغرض ہمارا کسی بھی شعبے سے تعلق ہو، ہم کسی بھی عہدے اور منصب پر فائز ہوں وقت کی پابندی کسی کے اندر بھی نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں اس سال نو کو یوں ہی ضائع اور برباد کرنا نہیں ہے بلکہ ایک ایک گھڑی اور ایک ایک لمحہ کی قدر کر کے اور اس کو کام میں لگا کر کامیابی اور ترقی کی راہیں طے کرنا ہے۔

ماضی کا محاسبہ

سال ۲۰۰۲ء میں ہم سے جو بھی کوتاہیاں اور غفلتیں ہوئی ہیں اور ہمارے اوقات جو ضائع و برباد ہوئے ہیں ہم اس کی تلافی مافات کے لئے تیار ہو جائیں اور ہم یہ محاسبہ کریں کہ ہماری عمر کے جو ایک سال کم ہوئے ہم نے اس میں کیا اچھا کارنامہ انجام دیا اور ہم نے کتنوں کی خیر خواہی اور بھلائی کی، ہم

نے کتنے غریبوں، کمزوروں، بے کسوں اور مظلوموں کی مدد کی اور ہم نے کتنا اجر وثواب کا کام کیا یا ہم نے ایسا کیا بھی کہ نہیں اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے اوقات کسی کام میں گذرے اور ہمارا وہ گذرا ہوا لمحہ کسی کام میں ختم ہوا۔ لیکن اگر ہم نے ایسا نہیں کیا، ہم نے کمزوروں اور مظلوموں کی مدد نہیں کی، ہم نے کسی کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ نہیں کیا اور کوئی مثالی کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ ہمارا وقت ظلم وستم اور جور جفاکشی میں گذرا، ہم سے برا اور خراب کام انجام پذیر ہوا تو پھر افسوس کرنے کا مقام ہے کہ ہماری زندگی رائیگاں اور برباد گئی اور اب ہم وقت کی قدر دانی کے لئے تیار ہو جائیں اور اسی میں ساری انسانیت کی کامیابی کا راز مضمر ہے اور یہی وہ چیز ہے کہ جس کو اختیار کر کے مغرب کامیابی وکامرانی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

یہاں تک تو عام بات تھی اور اس سے ہر کسی کا تعلق تھا اب ہم خصوصیت کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے ہم کلام ہیں کہ وہ اپنا دینی محاسبہ کریں کہ ہم سے دین کے اندر کتنی کوتاہیاں ہوئیں اور ہم احکامِ شریعت پر کتنا عمل پیرا رہے اور ہم سے دین اسلام کو کتنا نفع ونقصان پہونچا اور ہم نے اس کے واسطے کیا قربانیاں دیں اور ہم نے اس کے کتنے حقوق اور مطالبات کو پورا کیا، اس طرح ہم اپنی پوری زندگی کا احتساب کریں، ہمارے اسلاف کا تو کہنا ہے کہ روزانہ سونے سے پہلے اس کا محاسبہ ہر مسلمانوں کو کرنا چاہئے لیکن اگر ہم نے روزانہ نہیں کیا تو اب ہم سال نو کے موقع پر ایک بار محاسبہ ضرور کرلیں اور اگر ہم شریعت کے مطالبات پر پورے اتر گئے تو اللہ کا شکر ادا کریں اور اگر ہم سے کوتاہیاں ہوئیں تو ہم اس کی تلافی اور اصلاح کے لئے تیار ہو جائیں اور ہم خصوصیت کے ساتھ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں، اسلامی وضع قطع اور اسلامی لباس اختیار کریں اور حقوق العباد کا اہتمام کریں کہ اگر ہم سے حقوق اللہ میں کوتاہیاں ہوئیں تو ہم بچ سکتے ہیں لیکن حقوق العباد کے سلسلے میں ہم کسی بھی طرح راہ فرار اختیار نہیں کر سکتے ہیں اور ہر حال میں خدا کا خوف اور خشیت الٰہی ہمارے اندر ہو خواہ حالات موافق رہے یا ناسازگار، بہادر شاہ ظفر نے کیا ہی خوب کہا ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

(۲۹ر شوال المکرم ۱۴۲۳ھ)

موجودہ جنگی حالات میں خود احتسابی کی ضرورت

موجودہ زمانہ جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں، یہ انتہائی ظلم وجور، سرکشی اور جنگ کا زمانہ ہے، اس سے پوری دنیا کے امن پسند انسان پریشان اور خوفزدہ ہیں، وہ اس سے نجات کی مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں اور وہ اس سے اپنی نفرت کا برملا اظہار کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ظلم وستم اور جارحیت تھمنے کا نام نہیں لیتی، وہ دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے اور وہ آہستہ آہستہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے، چنانچہ ایسے حالات میں ایک مسلمان کا کیا فریضہ بنتا ہے؟ اس پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور اس کو ایسے حالات میں کیسے رہنا چاہئے، یہ ایک انتہائی اہم اور نازک ترین مسئلہ ہے۔

سب سے پہلے انفرادی طور پر تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی گذری ہوئی زندگی کا تحقیقی محاسبہ کریں۔ اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں اور سوچیں کہ ہم سے احکام الٰہی کی بجا آوری میں کتنی غفلتیں، سستیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں، ان کا محاسبہ کر کے اپنی زندگی میں نمایاں تبدیلی لانے کی کوشش کریں چنانچہ جب ہم اپنی زندگی کے مختلف لمحات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہماری پوری زندگی خدا کی نافرمانیوں اور اس کے احکام کی خلاف ورزیوں میں ملبس نظر آتی ہے، ہر طرح کے گناہ ہم سے سرزد ہو رہے ہیں، عوامی سطح سے لے کر خواص تک ان حرکتوں میں مبتلا ہیں اور ہر وہ گناہ جس سے ہمیں نبی اکرم ﷺ نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، ہمیں ان کی کچھ پرواہ نہیں، جھوٹ، دھوکہ بازی، مکاری، لوٹ، مار، ڈکیتی، تہمت، غیبت اور بے شمار برائیاں ہیں جن میں ہم ملبس ہیں اور اس طرح ان میں مبتلا ہیں کہ ان کا ارتکاب کرتے وقت ہمیں ان گناہوں کے گناہ ہونے کا خیال تک دل میں پیدا نہیں ہوتا ہے تو پھر اس پر شرمندگی اور اصلاح کا کیا مطلب؟ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم ان چیزوں کا محاسبہ کر کے ان گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کو ان گناہوں کی پلید سے پاک کریں۔

دوسری بات جو بہت زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ تمام مسلمان ایک نئی تحریک چلائیں جس کا مقصد تمام مسلمانوں کی دینی بیداری اور تمام احکام الٰہی کی بجا آوری ہو اور اس کام کے لئے معمر حضرات کے علاوہ نوجوانوں کو آگے بڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے، اس لئے کہ نوجوانوں کے اندر ایک خاص جذبہ اور متحرک اور فعال خون ہوتا ہے اور وہ جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں اور وہ اپنے قصد و ارادے کو تکمیل تک پہونچانے میں پس و پیش اور سستی نہیں کرتے ہیں اور کوئی بڑی سی بڑی پریشانی اور مصیبت بھی ان کے قصد و ارادے میں اضمحلال پیدا نہیں کرسکتی ہے، اس لئے اجتماعی طور پر اس کام کے لئے ایک نئی تحریک شروع کریں جس سے ان شاء اللہ مسلمانوں کے اندر نئی بیداری، نئی لہر نیا جذبہ اور شعورِ زندگی پیدا ہوگا اور اس کے اچھے ثمرات اور نتائج برآمد ہوں گے اور یہ تحریک نتیجہ خیز اور با مقصد ہوگی۔

ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ ہماری زندگی میں رجوع الی اللہ اور انابت الٰہی پائی جائے، نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات یہی ہیں کہ انسان ہمیشہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا رہے اور انابت الٰہی ان کی زندگی کا خاص امتیاز ہو، اس سے انسان اپنے پروردگار سے غفلت کا شکار نہیں ہوتا ہے اور شیطان انسان کی یہ حالت دیکھ کر بہت زیادہ رنجیدہ ہوتا ہے اور وہ اپنی محنت کو ایسے آدمی پر ناکام دیکھ کر کف افسوس ملتا رہتا ہے۔

چنانچہ موجودہ زمانہ جو شرور وفتن اور جنگ کا زمانہ ہے ایسے حالات میں اپنی حالت بدلنے کی خصوصی ضرورت ہے اور ایسے موقع پر نبی اکرم ﷺ کی پاک تعلیمات میں شرور وفتن سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب بھی ایسے حالات نمودار ہوں اور شرور وفتن زوروں پر ہوں تو چاہئے کہ تمام مسلمان اللہ کی طرف رجوع کر کے ان شرور وفتن سے اللہ کی پناہ طلب کریں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''عنقریب فتنے رونما ہوں گے...... تو جو کوئی اس میں یعنی ایسے پرفتن دور میں کوئی ٹھکانہ اور پناہ گاہ پائے تو چاہئے کہ وہ اس کی پناہ حاصل کرے'' (بخاری: ۲/۱۰۴۸) اور اللہ تعالیٰ کی پناہ سے اچھی پناہ اور کس کی ہوسکتی ہے؟ یقیناً اللہ تعالیٰ کی پناہ تمام دنیاوی پناہ سے بہتر ہے لہٰذا اللہ کی پناہ میں لوگوں کو آنا چاہئے۔

چنانچہ مسلمان جب ان حالات سے نبرد آزما ہوں اور وہ اس میں مبتلا ہوں تو بجائے اس کے کہ وہ حالات سے عاجز اور تنگ آکر اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور کافروں کی پناہ طلب کریں، ان سے فریاد کریں ان کے رحم وکرم اور عفو و درگذر کا امید وار بنیں اور ان کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ کر بیٹھ جائیں، بلکہ ایسے ہی مواقع کے لئے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم ہے کہ کافروں کی پناہ میں آنے کے بجائے

اللہ کی پناہ میں آئیں، ان کے سامنے روئیں، گڑگڑائیں اور اپنے گناہوں سے معافی چاہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کو اپنی پناہ میں رکھے گا اور اس کے بعد وہ ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ رہیں گے اور زمانے اور حالات ان پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔

دوسرا حکم ایسے موقع کے لئے یہ ہے کہ ایسے حالات میں مسلمان صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں اور وہ دین پر ثبات قدمی کا بھرپور ثبوت دیں، روایت میں آتا ہے کہ ایسے موقع پر صبر کرو اس لئے کہ تمہارے اوپر کوئی زمانہ نہیں آتا ہے مگر اس کے بعد والا زمانہ اس سے بھی زیادہ شر آمیز ہوتا ہے (بخاری: ۲ر۱۰۴۷) اس لئے ہوسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ آنے والا زمانہ سے کہیں زیادہ بہتر اور اچھا ہو اور وہ آنے والا زمانہ ہماری برداشت سے باہر ہو اور اس کے تحمل کی طاقت ہمارے اندر نہ ہو لہٰذا ان حالات سے پریشان اور افسردہ ہونے کے بجائے ان پر صبر کریں اور اس پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید وابستہ رکھیں، تو ان شاء اللہ ہم دنیوی اور اخروی دونوں لحاظ سے کامیاب ہوں گے حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مصیبتوں، پریشانیوں اور لاحق خطرات پر صبر کرے اور اس پر جزع وفزع نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں ضرور داخل کرے گا۔ (مسلم شریف)

ایسے حالات اور مواقع کے لئے ایک نسخۂ کیمیا اور نبی اکرم ﷺ کا حکم وجوبی یہ ہے کہ وہ اپنے درمیان غیروں کے خلاف متحد ومتفق ہو جائیں اور وہ اس کام کے لئے اپنی جماعت مسلمین سے جٹ جائیں اور وہ اپنے مسلمان حکمرانوں اور امام وقت سے چمٹ جائیں، اگر مسلمان ایسا کرلیں گے تو یقیناً مسلمانوں کا دور مثالی دور ہوگا اور ان کو دنیا کی کوئی طاقت وقوت پسپا نہ کرسکے گی اور پوری دنیا ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی، لیکن اگر مسلمانوں کا کوئی متفق علیہ جماعت اور امام نہ ہو تو اس کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ”پھر تو تم ان تمام فرقوں اور جماعتوں سے الگ تھلگ ہو جاؤ اگر چہ تمہیں درخت کی جڑ کو دانت سے مضبوطی سے پکڑنا پڑے یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے اور تم اس حال میں مرو کہ تم اسی حالت (تمام جماعتوں سے الگ تھلگ) پر قائم رہو“ (بخاری: ۲ر۱۰۴۹) اور یہ حکم ایسے پر آشوب دور کے لئے ہے جب کہ امام کا متعین کرنا ممکن ہی نہ ہو لیکن اگر امام وقت کی تعیین ممکن ہو تو پھر اس کی تعیین کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام مسلمان اپنا امیر منتخب کریں ایک دوسری جگہ نبی ﷺ نے فرمایا ”کوئی آدمی ایسا نہیں ہے کہ وہ جماعت (یعنی تمام مسلمانوں کی متفقہ جماعت) سے ایک بالشت بھی الگ ہو پھر وہ مرے مگر وہ جاہلیت کی موت مرے گا“ (بخاری: ۲ر۱۰۵۷)

اگر مسلمانوں کی کوئی متفقہ جماعت اور امام نہ ہوتو اس کی مثال بکریوں کی ریوڑ کی سی ہے کہ اگر تمام بکریاں الگ الگ ہوں تو بھیڑیا آکر آسانی سے ایک ایک کر کے تمام بکریوں کو ختم کر سکتا ہے لیکن اگر وہی بکریاں مجتمع ہوں تو ان کو ختم کرنا آسان نہیں ہوگا، اسی طرح سے اگر مسلمان الگ الگ فرقوں اور جماعتوں میں بٹے رہیں گے تو دشمنوں کو اچھا موقع ملے گا اور وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور موجودہ حالات میں مسلمانوں پر جو حملے ہو رہے ہیں وہ اسی تفرقہ بازی کا نتیجہ ہے کہ کل افغانستان پر حملہ ہوا، آج عراق پر جارحیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے اور آئندہ کوئی دوسرا مسلم ملک اور ریاست اس جارحیت کا نشانہ بنے گا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں تنازع پیدا نہ کرو ورنہ تو تم سب (میدان جنگ میں) پھسل جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی'' (الانفال: ۴۶) دوسری جگہ ہے ''اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو'' (آل عمران: ۱۰۳)

پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بھی مسلمانوں پر شرور وفتن کا زمانہ آئے اور حالات بگڑ جائیں تو ہمیشہ ایسے حالات میں انابت الٰہی اور آپسی اتحاد واتفاق کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے کہ جس کے بغیر انسان ہر جگہ ظلم وستم کا نشانہ بنائے جاتے ہیں، چنانچہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی میں انابت الٰہی نہیں پائی جاتی ہے اور ان کی کوئی عالمی متفقہ جماعت نہیں ہے اور نہ ہی پورے عالمِ اسلام اور مسلمانوں کا کوئی متفقہ امام ہی ہے جس کی وجہ سے آج مسلمان ہر طرف دبائے جا رہے ہیں، لہٰذا اب بھی مسلمان بیدار ہوں اور اپنا کوئی عالمی متفقہ امام منتخب کریں تو ان شاء اللہ یہ حالات بدل سکتے ہیں ورنہ تو ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا اور ہم دنیوی اور اخروی دونوں لحاظ سے خسارہ میں ہوں گے۔

(۱۵ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ)

فتح ونصرت کے لئے ایمانی قوت کی ضرورت

موجودہ زمانہ میں ہر چہار جانب سے دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو اپنے شکنجہ میں لئے ہوئے ہیں، ایک طرف کفار ومشرکین اور ہنود ہیں، تو دوسری طرف اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ (اسرائیل اور عیسائی) چنانچہ ایسے حالات میں ہم مسلمانوں کو کیا طریقہ کار اپنانا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے، تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے صحابہ کرام کا نمونہ موجود ہے، غزوۂ احزاب کا موقع ہے، چاروں طرف سے دشمنانِ اسلام مدینہ کو اپنے دائرۂ احاطہ میں لئے ہوئے ہیں ایک طرف مشرکین مکہ ہیں تو دوسری طرف اہلِ کتاب اور منافقین ایسے نازک وقت میں صحابہ کرامؓ نے صبر و استقامت سے کام لیا اور فرمانِ حق تعالیٰ ''وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ''پر پورے طور پر عمل کر دیکھایا تو اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدینِ اسلام اور جاں نثارانِ نبی ﷺ کی مدد فرمائی اور غیروں کو مغلوب کر دیا اور اس کے بعد باطل فرقے کا ارادہ بالکلیہ ہی ختم ہو گیا، اسی طرح جنگِ حنین کا منظر آپ کے سامنے ہوگا تو یہاں پر غور کرنے کا مقام ہے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی؟ کہ جس کی وجہ سے صحابہ کرامؓ اور مسلم قوم ہر میدان سے کامیاب وکامران واپس آتے تھے تو وہ ایمان کی طاقت ہی تو تھی۔

چنانچہ اسی طاقت وقوت کو اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرمایا ہے'' تم سب کمزور دل نہ ہو اور نہ غمگین رہو تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم مؤمنِ کامل ہو'' (آل عمران: ۱۲۹) اس آیت میں ہماری فتح وظفر کا اعلان ہے لیکن پھر بھی ہم مرعوب ومغلوب ہے تو اس کا بنیادی وجہ یہی ہے کہ آج ہمارا ایمان کمزور ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کامیابی وکامرانی کے بجائے شکست وریخت ہمارا مقدر بن گئی ہے حالانکہ ہم تو وہی مسلم قوم ہیں جنھوں نے اس سرزمین ہند پر ہزاروں سال حکومت کی ہے اور جنھوں نے سمندر، جنگل اور اس کے خونخوار جانوروں اور درندوں پر بھی حکومت کی ہے۔

لیکن آج ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم ہر چہار جانب بدنام ہیں، دہشت گردی، بنیاد پرستی

اور امن شکنی کا جھوٹا الزام صرف اور صرف ہمارے اوپر ثبت ہے، آج ہمیں مسلمان بن کر دنیا میں رہنا مشکل ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ اسی لئے ہوا ہے کہ ہمارا ایمان مضبوط نہیں ہے ہم صرف نام کے مسلمان باقی رہ گئے ہیں مسلمانوں کی صفات تک باقی نہیں رہیں، وہ جذبۂ اطاعت اور اخلاص وللھیت نہیں ہے کفر ہمارے اوپر ہنس رہا ہے، باطل ہم پر خندہ زن ہے لیکن ہم ہیں کہ ان سب چیزوں کو پسِ پشت ڈالے خدا کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔

جب باطل فرقے نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، اولیاءِ کرام اور اکابرینِ ملّت کے حالات وصفات کو پڑھتے ہیں تو وہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کہتے ہی ''یہ ہیں قابلِ قدر مسلمان اور انسان، کہ انسان انہی کو کہنا بجا ہوگا'' لیکن جب وہ ہمارے اخلاق واطوار کو دیکھتے ہیں تو وہ ہم سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ ہمارا ایمان واخلاص، اقوال و افعال اور اخلاق وکردار صحابہ جیسے نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہم ذلت ورسوائی کی زندگی گذار رہے ہیں، ہمیں خود کو اپنے اوپر ماتم کرنا چاہئے اور ہمیں اپنے ایمان واخلاص اور اقوال وافعال کو درست کرنا چاہئے اور اخلاقِ حسنہ اور کردارِ حمیدہ سے مزّین ہونا چاہئے تب جا کر ہم کہیں مؤمن کہلانے کے لائق ہوں گے، اگر ہماری تمنا ہے کہ پھر اس سرزمین پر دوبارہ سلطنت الٰہی کا قیام ہو تو سب سے پہلے ہمیں ایمان کو کمالیت کا تاج پہنانا ہوگا، لیکن پھر بھی ہم کمزور ایمان والے میدان کارزار میں غالب آسکتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری کامیابی وکامرانی اور فتح وظفر کا اعلان اپنے کلام پاک میں یوں فرمایا ہے ''اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ تم میں سستی ہے سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں گے دو سو پر اور اگر ہوں تم میں ہزار تو غالب ہوں گے دو ہزار پر اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے'' (الانفعال:٦٦)

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ تمہارا کمزور ایمان والا کفار کے دو گنے لشکر پر غالب آجائیں گے اور آیت میں ''ضعفا'' سے مراد ''ضعفِ ایمانی'' ہے یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ دوگنا ہی پر منحصر نہیں ہے کہ اس سے زیادہ پر غالب نہیں ہوں گے اور شکست کھا جائیں گے ایسی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھئے اسلامی جنگ کے کتنے ہی واقعات آپ کو ایسے مل جائیں گے جس میں اہلِ ایمان کی لشکر اپنے سے کئی گنا فوج سے ٹکرا گئی اور مؤمنوں کو کامیابی ہوئی اندلس کے واقعے کو یاد کیجئے کہ ابتداءً دس ہزار نے دو لاکھ کا مقابلہ کیا اور دشمن کو پشت پھیرنے پر مجبور کر دیا اور پھر بارہ ہزار نے پورے ملک

اندلس کا یکے بعد دیگرے مقابلہ کیا اور اسلام کا جھنڈا لہرا کر سانس لیا، اسی طرح سے جنگِ موتہ کے موقع پر تین ہزار صحابۂ کرامؓ دو لاکھ کی جمعیت سے سینہ سپر ہو گئے بالآخر صحابہ کرامؓ کو کامیابی نصیب ہوئی بات درحقیقت یہ ہے کہ ان حضرات میں خوفِ خدا تھا، وہ غیر اللہ سے ڈرتے نہیں تھے، وہ دنیا اور اس کی زیب و زینت سے بھاگتے تھے اور وہ ایمانِ کامل کی دولت سے مالا مال تھے، یہی وجہ تھی کہ دنیا اور اقتدار و سلطنت ان کا پیچھا کرتی تھی، لیکن جب سے ہمارے اندر سے خوف خدا جاتا رہا اور دنیا کی محبت دل کے اندر راسخ ہوتی گئی تو ہم پیچھے ہی ہوتے گئے اور غالب ہونے کے بجائے مغلوب ہونے لگے۔

ملّتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس امت میں اتحاد و اتفاق نہیں پایا جاتا ہے مسلم قوم اختلاف و انتشار اور بغض وعناد کا شکار ہے، لہٰذا مسلم قوم کو ایک پلیٹ فارم پر کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کے پرچم تلے جمع ہونا چاہئے اور اس میں کسی مسلک کا اعتبار نہ کیا جائے خواہ وہ کسی بھی مسلک کے ماننے والے ہوں، اور آج کے دور میں اسی وجہ سے مسلم قوم میں اختلاف و انتشار پایا جاتا ہے، لہٰذا مسلم قوم میں اتحاد و اتفاق کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔

ملتِ اسلامیہ کے اسبابِ زوال میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مسلم قوم میں بزدلی اور موت سے خوف و ہراس پایا جاتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو انسان کے فتح کئے ہوئے میدان کو شکست سے بدل دیتی ہے جس کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا ہمیں اپنے اندر سے بزدلی اور موت سے خوف و ہراس کو بھی دور کرنا ہوگا اور اس کے بجائے شجاعت و بہادری اور موت کی خواہش و تمنا اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔

نیز ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم قوم دنیا اور اس کے باطل فرقوں کے اسلحوں پر نظر کر کے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تذبذب کے شکار ہو جاتے ہیں، بس ہمیں تو اسلحہ پر نظر کرنا نہیں ہے اس لئے کہ ہمارے ساتھ تو احکم الحاکمین کی مدد و نصرت شاملِ حال ہے اور قرآن میں اسی کو دعائیہ انداز میں کہا گیا ہے'' تو ہمارا آقا ہے پس تو ہماری مدد فرما کافر قوم کے مقابلہ میں'' (البقرۃ: ۲۸۶) اور صاحبِ جلالینؒ نے اسی ضمن میں لکھا ہے'' دلیل و حجت اور غلبہ کے قیام کے ذریعے ان سے جنگ و جدال کرنے میں اس لئے کہ آقا کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے ماتحت کی مدد کرے دشمنوں کے مقابلہ میں ....'' (جلالین: ۴۵)

بھلا جس کے ساتھ احکم الحاکمین کی طاقت ہو اور اس کی مدد و نصرت ہو کیا وہ دنیاوی اسباب و وسائل پر نظر کر سکتا ہے لیکن ہم ہیں کہ دنیاوی اسباب و وسائل اور مغربی اسلحہ سے خوفزدہ ہو کر پیچھے رہ جاتے ہیں یہ

سب سامان اور تیاری تو دشمنوں پر رعب اور دھاک بٹھانے کا ایک ظاہری سبب ہے باقی فتح وظفر کا اصلی سبب تو خدا کی مدد ونصرت ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ اسباب و وسائل بالکلیہ ہی اختیار نہ کیا جائے بلکہ ظاہری اسباب کے اختیار کرنے کا حکم تو خود رب ذوالجلال نے دیا ہے (ترجمہ) ''اور تیاری کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کرسکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر'' (الانفال: ۶۰) یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ ترک کردیا جائے نہیں بلکہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سکے دشمنوں سے لڑنے کے لئے سامانِ جنگ تیار کرے آیت مذکورہ میں ''ما استطعتم'' کی قید لگا کر یہ اشارہ فرمادیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جتنا اور جو سامان ہے تم بھی ویسا ہی اور اتنا ہی حاصل کرلو بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کرلو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اس لئے اسبابی دنیا میں آکر آلات حرب وضرب بھی تیار کرنا ہوگا لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم اسلامی ممالک کے لئے ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور جہاں وہ بآسانی تیار کر سکتے ہوں لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو غافل بھی نہیں رہنا چاہئے کہ وہ اپنا دفاع بھی نہ کرسکیں اور طاغوتی قوت اپنا سر ابھارے اور مسلمانوں کو نیست ونابود کردے، اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ حتی المقدور تیاری کریں خواہ معمولی ہی سہی اس لئے کہ اس سے تو تھوڑا بہت دفاع ہوسکتا ہے، باقی اللہ چاہے تو اپنی مدد ونصرت کے ذریعے کامیاب اور غالب کرے یا اپنی حکمت عملی کے تحت مغلوب کرے، لیکن اگر اب بھی مسلمانوں نے اپنے ایمان کو کمالیت کا تاج نہیں پہنایا، آپس میں اتحاد واتفاق پیدا نہیں کیا، اپنے اندر شجاعت وبہادری پیدا نہیں کی اور فرق باطلہ کے اسلحوں سے ڈرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب اس سرزمین پر اندلس کے واقعے دہرائے جائیں اور تاتاریوں جیسے فتنے رونما ہوں لہٰذا اب بھی مسلمانوں کے جاگنے کا وقت باقی ہے۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(۱۱؍ صفرالمظفر ۱۴۲۴ھ)

توبہ انسان کی فلاح اور نجات کا ایک اہم ذریعہ

موجودہ دور میں دنیا کا انسانی معاشرہ اتنا بگڑ چکا ہے کہ غضبِ الٰہی کو دعوت دے رہا ہے جس کا ظہور کبھی زلزلہ کی شکل میں تو کبھی آندھی اور طوفان کی شکل میں اور کبھی قحط سالی اور خشک سالی کی شکل میں ہم پر ہوتا ہے، جس سے نجات کا واحد ذریعہ ''رجوع الی الله'' ہے، اگر انسان اپنے گناہوں پر نادم اور شرمندہ ہو کر اللہ سے رجوع ہو تو غضب الٰہی دور ہو سکتا ہے اور رحمتِ الٰہی کی بارش ہو سکتی ہے۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ رحمان و رحیم ہے اس لئے اس نے انسانوں کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ اس کی تاکید بھی کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی توبہ کی تعلیم و ترغیب دی ہے۔

قرآن و حدیث میں توبہ کی تاکید:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو توبہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''اے مومنو! تم اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ'' (النور: ۳۱) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے ''اے میرے وہ بندو! جنہوں نے (گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا کر) اپنی جانوں پر حد سے زیادہ ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کر دے گا'' (الزمر: ۵۳)

نبی رحمت ﷺ نے توبہ کی حقیقت و اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انسانی جذبات اور اس کے ساتھ خیر خواہانہ تعلق کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے نصیحت کی، حضرت ابو ہریرہؓ راوی حدیث کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں دن بھر میں ستر مرتبہ سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس کے سامنے توبہ کرتا ہوں (بخاری: جلد ۲ رصفحہ ۹۳۳) دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کیا کرو اور مغفرت طلب کیا کرو میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں (مسلم: ۲/۳۴۶)

دونوں حدیثوں میں توبہ واستغفار کی تعداد کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ کثرتِ توبہ کا بیان اور اس کا اظہار مقصود ہے کہ دیکھو! میں تو نبی معصوم ہوں میرے تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے بخشائے ہیں لیکن اس کے باوجود میں اس کثرت سے توبہ کرتا ہوں تو تم جو گناہوں سے پاک بھی نہیں ہو تو تمہیں اور کتنی کثیر تعداد میں توبہ واستغفار کا اہتمام کرنا چاہئے، لہٰذا تم ابھی بھی اللہ کے سامنے توبہ واستغفار کرنا شروع کردو اور اس کی عادت بنالو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ جس کا بندہ کے ساتھ مظاہرہ ہو رہا ہے۔

تو مجھے نواز دے تو یہ تیرا کرم ہے ورنہ
تیری رحمتوں کا بدلہ میری بندگی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت اور خمیر میں نیکی کی طرف رغبت اور گناہ کی طرف میلان کا مادہ ڈال دیا ہے، اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ گناہ وعصیان کا ارتکاب کرے یا وہ اطاعت الٰہی کو بجالائے اور جب وہ اس اختیار کے حصول کے باوجود اللہ کی معصیت و نافرمانی سے بچ کر اطاعت الٰہی میں اپنی زندگی صرف کرے تو اس سے اللہ تعالیٰ حد درجہ خوش ہوتا ہے اور اس کو انعام سے نوازتا ہے اور اسی بنیاد پر ان کو ملائکہ پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے۔ چوں کہ ملائکہ ایک ایسی مخلوق ہیں جن کو جو کوئی حکم مل گیا بس وہ اسی کو کرتے رہتے ہیں اور معصیت و نافرمانی کا گذر بھی ان سے نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت بسایا اور ان کو جنت کے ایک پھل کھانے سے منع کردیا کہ فلاں درخت کا پھل مت کھانا لیکن مردود شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو معصیت کا ارتکاب کروادیا اور جب حضرت آدم علیہ اسلام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم سے معصیت الٰہی کا ارتکاب ہوگیا ہے تو فوراً انہوں نے توبہ واستغفار کرنا شروع کردیا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے چند کلمات سیکھ لئے جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے" فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "(البقرہ:۳۷) یہی معصیت وتوبہ کا پہلا مرحلہ ہے اور یہیں سے توبہ کی ابتداء ہوئی ہے اور تاریخ انسانی میں سب سے پہلی توبہ بھی یہی ہے۔

آج بھی انسان اسی طریقہ کار کو اختیار کر کے کامیابی اور فلاح و بہبود کی راہ ہموار کر سکتے ہیں جس کو اختیار کر کے حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دور کیا تھا جو ان کے لئے ملعون شیطان اور گناہ سے مقابلہ کرنے کے لئے مضبوط اور ٹھوس ہتھیار ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بندے کی توبہ سے حد درجہ خوشی ہوتی ہے!

رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کہ کسی مسافر کو اس کے وہ اونٹ مل جانے پر جس پر وہ زادراہ کے ساتھ کسی چٹیل میدان میں سفر کر رہا ہو اور اتفاق سے وہ اونٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ جائے اور جب وہ تھک ہار کر سو جائے اور پھر وہ اٹھے تو اونٹ اس کے سامنے موجود ہو تو اس وقت اس مسافر کو جتنی خوشی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے (بخاری: ۹۳۳/۲، مسلم: ۳۵۵/۲) اور اللہ تعالیٰ کو اتنی خوشی کیوں کر نہ ہو؟ جب کہ اس کی پیدائش سے لے کر ہوش سنبھالنے اور آخر تک اس کی پرورش کی پھر وہ اپنی نادانی سے ازلی دشمن شیطان کے چکر میں آکر گمراہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی طاعت و بندگی سے اپنا منھ پھیر لیا اب جب کہ وہ اپنی نادانی اور کم فہمی پر شرمندہ ہو کر اللہ کے سامنے معافی کا طلبگار ہے اور ہدایت کا متلاشی ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو خوشی ہوتی ہے اور فرماتا ہے: میرے بندہ نے گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اس نے جانا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کا مواخذہ کرتا ہے تو یقیناً میں نے اپنے بندہ کی مغفرت فرمادی تو (اب) وہ جو چاہے کرے (مسلم: ۳۵۷/۲) اور اگر العیاذ باللہ وہ راہ راست پر نہ آتا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوتا اور انعام خداوندی سے محروم ہوتا۔

توبہ کا دروازہ بند کب ہوگا؟

اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم کا فیضان انسانوں پر مسلسل جاری ہے اور جب بھی کوئی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن یہ ایک وقتِ متعین تک ہے جس دن اس کی مدت تکمیل کو پہنچ جائے گی توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اس دن کے بعد کسی کا توبہ معتبر نہیں ہوگا۔ صحابی رسول حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ رات میں اپنی رحمت کا ہاتھ دراز فرماتا ہے تا کہ دن میں گناہ کرنے والا بندہ رات کو اس گناہ سے توبہ کر لے، اسی طرح دن میں اپنی شفقت و محبت کا ہاتھ دراز فرماتا ہے تا کہ رات میں گناہ کرنے والا گنہگار بندہ دن کو توبہ کر لے (اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم کی یہ بارش قیامت تک جاری رہے گی اور توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا) یہاں تک کہ سورج (مشرق کے بجائے) مغرب سے نکلے (اور قیامت کا ظہور ہو جائے) (مسلم: ۳۵۸/۲)

ایک دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: جس شخص نے سورج کے مغرب سے نکلنے سے پہلے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ (مسلم ۲/۳۴۶) ان دونوں احادیث کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے: ترجمہ: ''جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی (قیامت کی) آجائے گی تو اس دن اس شخص کا ایمان لانا کوئی نفع نہیں دے گا جس نے اس سے پہلے ایمان نہیں لایا'' (الانعام: ۱۵۹)

توبہ کے شرائط

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ جوشوافع کے بہت بڑے محدث گذرے ہیں انہوں نے آداب وشرائط توبہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ہر گناہ سے توبہ فرض ہے اور گناہ کی دو قسمیں ہیں اس لحاظ سے توبہ کی بھی دو قسمیں ہوں گی ایک وہ گناہ جس کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ نہ ہو بلکہ صرف حقوق اللہ سے ہو تو اس گناہ سے توبہ کی قبولیت کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) سب سے پہلے وہ اس گناہ کو چھوڑ دے (۲) دوسرے یہ کہ اس گناہ پر دل سے شرمندہ ہو (۳) تیسرے یہ کہ وہ اس گناہ کے دوبارہ نہ کرنے کا عزم مصمم کرے، تو اس کی توبہ قبول ہوگی۔ اور اگر ایسا گناہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو اس گناہ سے توبہ کی قبولیت کے لئے چار شرطیں ہیں۔ تین وہ شرطیں جو پہلے گذر چکی ہیں، چوتھی شرط یہ ہے کہ مظلوم کے حق سے دستبرداری اختیار کر لے اور اگر وہ گناہ مال وزر کے سلسلے میں ہوا ہے تو اس کو واپس کر دے یا معاف کرالے اور اگر کسی پر تہمت لگائی ہے تو اپنے اوپر حدِ قذف لگوالے اور اگر کسی کی غیبت کی ہے تو اس سے صفائی کر کے معافی چاہ لے۔ تب جا کر توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ اللہ ہمیں صحیح اور مقبول توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کے گناہ سے محفوظ رکھے۔ آمین

(۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ)

تقویٰ فسق و فجور کے عدمِ ارتکاب کا نام ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فطرت انسانی کے اندر ورع وتقویٰ اور زہد وقناعت کے ساتھ فسق و فجور اورعصیان وطغیان کے مادے ودیعت کرر کھے ہیں ۔اب انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ورع وتقویٰ اور زہد وقناعت کو اپنا لائحۂ عمل بنائے اور اپنی زندگی کو اطاعت خداوندی میں گذارا رے اور چاہے تو فسق و فجوراور معصیت کو اپنا طریقہ کار بنائے اور عصیان خداوندی میں اپنا قیمتی وقت گذارے ،اب اگر انسان اطاعتِ خداوندی میں اپنے قیمتی لمحات کو گذارتا ہے تو یہ اطاعت خداوندی اس کے لئے موصل الی اللہ ہے اور کون ایسا انسان ہے؟ جو خدائے بزرگ کی خوشنودی اور جنت کا خواستگار نہیں ہے اور اگر انسان معصیت خداوندی میں اپنی حیات مبارکہ کو ضائع و برباد کرتا ہے تو یہ عصیان خداوندی واصل جہنم اور غضب الٰہی کو دعوت دینے والی ہے۔

اللہ رب العزت جو فاطر السموت والارض ہے جو انسان کا خالق و مالک ہے اس نے شمس وقمر، لیل ونہار، زمین وآسمان اور خود انسان کی قسم کھا کر فرمایا'' کہ اللہ رب العزت نے انسان کی خمیر میں فسق و فجوراور زہد وتقویٰ کو ودیعت کر رکھی ہے، یقیناً وہ آدمی کامیاب وکامران اور بامراد ہوا جس نے اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھا اور وہ شخص خائب وخاسر اور ہلاک و برباد ہوا جس نے اپنے آپ کو اپنے پروردگار سے غفلت میں ڈالے رکھا۔'' (الشمس: ۸، ۹، ۱۰)

انسان کا دنیا میں زندگی گذارنا

انسانوں کے دنیا میں زندگی گذارنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو انسان اطاعت میں زندگی گذارے اور یا تو نافرمانی میں خواہ وہ کسی بادشاہ ملک کا مطیع ہو یا کسی صوبے کے امراء کی اطاعت کرتا ہو غرض انسان کسی نہ کسی کی اطاعت ضرور کرتا ہے اور عدم اطاعت کی صورت میں بادشاہ ، گورنر اور مالک ضرور سزا دیتا ہے اور کبھی کبھار ان کے بہت زیادہ اطاعت گذار ہونے کی وجہ سے معاف اور در گذر بھی

کر دیتا ہے تو اللہ رب العزت جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور احکم الحاکمین ہے تو اس کی اطاعت کیوں نہ کی جائے اور اس کو عدم اطاعت کی صورت میں سزا کا حق کیوں نہ ہو اور خالق کائنات نے ان دونوں زندگی کو قرآن حکیم میں واضح کر دیا ہے۔

قرآن کے نزول کا مقصد اصلی یہی ہے کہ قرآن اطاعت الٰہی کی لوگوں کو ترغیب دے اور نافرمانی سے ڈرائے دھمکائے اور خوف دلائے چنانچہ قرآن کریم کے اندر پہلے فجورھا کو لایا ہے اور بعد میں تقویٰھا کو اس سے یہ معلوم ہوتا۔ ہے کہ انسان کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے اور اس کی نگہداشت اور تعلیم وتربیت کا انتظام نہ کیا جائے تو وہ فسق و فجور کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اس کو لبیک کہتا ہے اور تقویٰھا کے بعد میں لانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی عادت کے مطابق برائی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو اس کے اندر اس کی بھی صلاحیت ہے کہ وہ صحیح نگہداشت اور تعلیم وتربیت ملنے کے بعد احتراز عن المعصیت اور نیکی کی طرف راغب ہو اور اس میں اس کو دشواریاں۔ پریشانیاں اور نفس کے خلاف باتوں کو جھیلنی پڑتی ہیں اور انسان کے سنوارنے میں جتنی کوششیں کی جاتی ہیں وہ تو اظہر و ابہر ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سارے افراد بگڑ جاتے ہیں اور اگر کسی کو گمراہ کرنا اور بگاڑنا ہو تو آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں تو وہ خود بخود فاسق و فاجر بن جائے گا جس کا کہ آئے دن اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ خراب بننے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور عوام کی اکثریت گناہ وعصیان میں مبتلا ہے ان کو نماز، روزہ اور دینی کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تو ان سب کی ذمہ داری بھی علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ شہر شہر اور قریہ قریہ جا کر وعظ ونصیحت کے ذریعے ان کی اصلاح کریں ہمارے اسلاف نے تو اس ذمہ داری کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور الحمد للہ ابھی بھی بہت سے اللہ کے بندے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں ارشاد خداوندی ہے ''اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ '' (العصر:۲) سارے ہی انسان خسارے میں ہے اور اس سے چار قسم کے لوگ مستثنیٰ ہیں۔

۱۔مومن باللہ۔ ۲۔عامل بالصالحات۔ ۳۔حق کی تلقین کرنے والا۔

۴۔صبر کی تلقین کرنے والا۔

حق وصبر کی تلقین کرنے والے کے اوپر ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دین حق کو ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح پیش کرے اور حکمت وموعظت کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دے اور اس میں جو رکاوٹیں اور پریشانیاں آئیں ان پر صبر کریں۔

فسق و فجور

رہی بات نفس گناہ کی تو انسان جن گناہوں میں سب سے زیادہ مبتلا ہے وہ اس کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے اس کے بعد غیبت، چغلخوری اور مکر وفریب ہے اور جھوٹ تو ایسا گناہ ہے جو انسان کو تمام گناہوں پر آمادہ کرتا ہے، اگر آدمی جھوٹ نہ بولے تو آدمی یہ خوف محسوس کرتا ہے کہ اگر کسی کو میری یہ بات معلوم ہوگئی تو لوگ میرے عیب کے ظاہر ہونے کے بعد مجھے بُرا سمجھیں گے اور مجھ سے نفرت کریں گے تو انسان یہ سوچ کر بڑے بڑے گناہوں سے رُک جاتا ہے اور اس کے کرنے کی جرأت نہیں کرتا اور جو جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اگر کسی کو معلوم بھی ہو جائے تو انکار کر دیں گے اور جھوٹی قسم کے ذریعے بچ جائیں گے، اِسی وجہ سے وہ بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور غیبت تو ایسا گناہ ہے کہ اس سے اللہ کی پناہ چنانچہ آپ ﷺ نے غیبت کرنے والے شخص کو اپنے مسلمان بھائی کا گوشت کھانے والا فرمایا ہے اور چغلخوری تو انتہائی گھناؤنی بات ہے اور غیبت تو کچھ نہ کچھ حقیقت کا لباس پہن کر رہتی ہے لیکن چغلخوری تو بالکل جھوٹی اور افتراء پردازی کا پتلہ ہے اور مکر وفریب تو شیطانوں اور کافروں کا خاص شیوہ ہے لیکن افسوس آج کے مسلمانوں پر کہ وہ اس گناہِ عظیم میں مبتلا ہیں۔

زنا کی قباحت وشناعت

آپ ﷺ نے تو تمام گناہوں کی جڑ شراب کو قرار دیا ہے اور اس کو ''ام الخبائث'' سے تعبیر فرمائی ہے یہ تو اپنی جگہ پر حقیقت ہے، لیکن راقم الحروف اس کو استثناء کرتے ہوئے سب سے بڑا گناہ تمام گناہوں کی جڑ، ام الخبائث اور بے حیائیوں کا اڈہ زنا کو قرار دیتا ہے جس کی قباحت و شناعت تمام قوموں کے درمیان مسلم ہے لیکن آج کے حقوق انسانی کے علمبردار، حریت نساء کے دامن گیر، تہذیب و تمدن کے پیکر اور انسانی مساوات کے قائل اور دعویدار یورپ و امریکہ زنا جیسی قبیح اور ناشائستہ فعل کو رواج دے رہے ہیں اس کی عالمی سطح پر اشاعت کے لئے نت نئے طریقے ایجاد کر رہے ہیں اور ان ایجادات کو اختیار کرتے ہیں اس سے اجتناب کی نصیحت کرنے والوں کو قید و بند کی سزا دیتے ہیں، ان عقل کے دشمنوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم دوسرے کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے ساتھ کیسے زنا کریں؟ جب کہ ہمیں یہ بات گوارہ نہیں اور ہم یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری

ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے ساتھ کوئی زنا کرے (مگر وہ لوگ جن کے دل کی ضمیر ہی مردہ ہو چکی ہو ایسے لوگ اپنے ان محرمات کے ساتھ خود ہی زنا کا ارتکاب کرتے ہیں) جب یہ برداشت نہیں کرتے تو پھر ان کے ہاں زنا ثریا کی چوٹی کو کیوں چھو رہی ہے؟ اس کے مرتکبین کے لئے سزا کیوں متعین نہیں ہے؟ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ ان جیسے زنا کے مرتکبین کو پسند کرتا ہے کہ ان کی محرمات کے ساتھ اس قبیح فعل کا ارتکاب کرے، ان کے اندر سے غیریت انسانیہ اور حمیت بشریہ گویا مفقود ہو گئی کہ ہم جس سے یہ بدفعلی کر رہے ہیں یہ بھی تو کسی کی مائیں ہوں گی، کسی کی بہنیں ہوں گی، کسی کی بیٹیاں ہوں گی اور کسی کی بہو بیویاں ہوں گی، ہم کیسے ان سے یہ بدفعلی کریں اور کیوں کر کریں اور شرعی طریقہ پر کیوں نہ کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خدائی دین سے کوسوں دور ہیں۔

اللہ رب العزت ہلاک و برباد کرے ایسے مسلمانوں کو جو یہ فعلِ بد کر کے توبہ نہیں کرتے اور قانون کے دائرے میں آنے کو اپنے لئے شرم و عار محسوس کرتے ہیں اور اس میں اپنے لئے کسر شان سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اس فعل کے ارتکاب میں شرم و عار محسوس نہیں کرتے اگر یہ لوگ اس فعل ہی کے ارتکاب میں شرم و عار محسوس کرتے تو یہ ان کے لئے کہیں زیادہ بہتر اور ذخیرۂ آخرت ہوتا اور الٹے توبہ کرنے ہی کو باعثِ شرم و حیا سمجھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بہت زیادہ پسند فرماتا ہے حدیثِ قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بندہ گناہ کر کے توبہ کرے اور میں اس کی توبہ قبول نہ کروں۔

زہد و تقویٰ

رہی بات تقویٰ کی تو اپنی زندگی کو اس طرح گذارنا کہ پوری زندگی پر کوئی دھبہ نہ لگنے پائے یا جب سے وہ گناہوں اور بُرائیوں سے بچنے کی نیت کرے اور توبہ کرے تو اس کے بعد سے وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے اور کسی ایسی معصیتِ خداوندی کا ارتکاب نہ کرے جو غضبِ الٰہی کا باعث ہو، یعنی تقویٰ فسق و فجور کے عدم ارتکاب کا نام ہے اور قرآنِ کریم کے اندر "اِتَّقُوا اللّٰہ، لِلْمُتَّقِیْنَ" اور "اَلتَّقْوٰی" کے الفاظ سے انسانوں کو اس کے اختیار کرنے پر اُبھارا ہے اور قرآنِ کریم نے تقویٰ اختیار کرنے والا یا متقی شخص (۱) غیب پر ایمان لانے والوں، (۲) نماز ادا کرنے والوں، (۳) اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والوں، (۴) جمیع کتب سماویہ پر ایمان لانے والوں، (۵) اور آخرت پر ایمان لانے

والوں کو کہا ہے۔ (البقرة: ۳، ۴)

ایمان بالغیب

غیب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کی نظروں سے غائب اور اوجھل ہے اس پر یقین کرنا مثلاً اللہ، ملائکہ، آخرت، جنت، جہنم اور پل صراط وغیرہ جیسی مخفی اور پوشیدہ باتوں پر ایمان لانا اور ان کا یقین اپنے دل میں پیدا کرنا اور یقین کر کے ان کو اپنی عملی زندگی میں لاگو کرنا اور یہ تمام غیوبات اور پوشیدگی صرف ہماری نظروں کے اعتبار سے ہے اللہ سے کوئی چیز غائب اور مخفی نہیں ہے۔

اقامت صلوٰۃ

یعنی نماز کو قائم کرنا اور جماعت کے ساتھ ادا کرنا صرف نماز پڑھنے سے نماز قائم نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کو نماز کی دعوت دینا تب اقامت صلوٰۃ ہوگی ورنہ تو ادائے صلوٰۃ ہوگی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ''یؤدون الصلوٰۃ'' نہیں فرمایا ہے بلکہ فرمایا ''یُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ'' اس لئے جب تک نماز کو اپنی زندگی میں لاگو کرنے کے ساتھ دوسروں کو دعوت نہ دی جائے وہ اقامت صلوٰۃ نہیں ہوگی۔

انفاق فی سبیل اللہ

اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا یعنی زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور صدقۂ واجبہ وغیرہ کا ادا کرنا، اسی طرح سے صدقۂ نافلہ کا اہتمام کرنا۔

ایمان بجمیع الکتب السماویہ

اس کا مطلب ہے تمام کتب سماویہ پر ایمان لانا اور رہی بات عمل کرنے کی تو عمل کرنے کا وجوب صرف قرآنِ حکیم پر ہے، اس لئے کہ قرآن ناسخ ہے اور بقیہ تمام کتب سماویہ اس سے منسوخ ہیں اور تمام کتب سماویہ پر ایمان لانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح فرمایا ہے۔

''کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر بھی جو

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں'' (البقرہ:۱۳۶)

ایمان بالآخرۃ

تقویٰ کی پانچویں اور آخری صفت آخرت پر ایمان لانا یعنی اس بات کا یقین کرنا کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جس دن یہ دنیا اپنی اختتام کو پہونچ جائے گی، دنیا فنا اور درہم برہم ہو جائے گی اس کے بعد قیامت قائم ہوگی جس کے اندر تمام انسانوں کو اکٹھا کیا جائے گا اور ان سب سے حساب و کتاب لیا جائے گا۔ قرآنِ حکیم نے ان سب باتوں پر ایمان لانے والوں کو متقی کہا ہے اور جو شخص ان سب باتوں پر ایمان رکھے گا اور یقین کرے گا وہ کبھی بھی کسی بُرائی اور گناہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، ہر قسم کی برائی سے محفوظ رہے گا اور اپنے آپ کو بچائے گا۔

الغرض انسان دنیا میں دو ہی طریقے پر زندگی گذارتا ہے ایک یا تو فسق و فجور میں مبتلا ہو کر کے اور یا تو ورع و تقویٰ کو اختیار کر کے، البتہ جو انسان پہلے طریقے پر زندگی گذارتا ہے تو وہ مستحقِ نار، اللہ کے غضب و غصہ اور قہر کا مستحق ہوتا ہے اور جو ان سب باتوں سے ہٹ کر ورع و تقویٰ کو اپنا لائحۂ عمل بنا کر دنیا میں رہتا ہے تو وہ مستحقِ جنت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حقدار ہوگا اور ایسے ہی بندوں سے کل جنت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کہے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے تو بندہ کہے گا کہ یا ربِ کریم اب میری رضا کیا ہوگی جب کہ تو نے دائمی جنت نعیم عطا کی ہے اور اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں تمہیں مزید اپنی اور رضامندی کا پروانہ انعام کے طور پر عطا کرتا ہوں کہ میں تم سب سے خوش اور راضی ہو گیا، اب میں کبھی بھی تم سے ناراض اور غصہ نہیں ہوں گا۔ (بخاری: جلد۲، صفحہ ۹۶۹)

(۲۷ر جمادی الآخر ۱۴۲۳ھ)

*****

استقبال ماہِ رمضان المبارک

شعبان کا مہینہ اپنے اختتام پر ہے اور رمضان المبارک کا مہینہ ہمارے اوپر سایہ فگن ہے۔ جس کی فضیلت و اہمیت خود قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے، اس کی فضیلت کے لئے قرآن کریم کی یہی آیت کافی اور مستغنی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے'' (البقرہ: ۱۸۵) اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ اس مبارک مہینہ میں قرآن مجید کا نزول ہوا ہے، مزید برآں نبی اکرم ﷺ نے اس مبارک مہینہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے مقدر میں رمضان کا وہ مبارک مہینہ آنے والا ہے جس کے روزے کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر فرض قرار دیا ہے اور اس مہینہ میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور اس مہینہ میں شیطان مردود جکڑ دیا جاتا ہے

(مشکوٰۃ شریف: ۱۷۳)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو چیز جتنی فضیلت و اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس کی عزت وتکریم اور احترام بھی اسی قدر کیا جاتا ہے، جیسا کہ ہمارے مادر وطن ہندوستان میں ۱۵ راگست یا ۲۶ رجنوری کا دن جب قریب تر ہوجاتا ہے تو اس کی تیاری حد سے زیادہ تیز کردی جاتی ہے یا جیسا کہ جب کوئی وزیر اعظم یا صدر مملکت ہندوستان کے دورے پر آتا ہے تو اس کی آمد سے قبل ہر طرح کی تیاری مکمل کرلی جاتی ہے۔ اسی طرح سے یہ رمضان المبارک کا مہینہ جو تمام مہینوں سے افضل ہے اس کا بھی اہتمام اور تیاری پہلے سے کی جانی چاہئے، یہی وجہ ہے کہ احادیث میں شعبان میں بھی روزہ رکھنے کی تعلیم وترغیب دی گئی ہے تاکہ اس کی عادت بن جائے اور فرض روزہ کی ادائیگی میں سستی، غفلت اور کوتاہی نہ ہو۔

یہ تو بندوں کی طرف سے تیاری اور اہتمام ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو اس ماہ کی تیاری شوال ہی سے شروع کرکے شعبان کے اختتام تک کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جنت

سجائی جاتی ہے رمضان المبارک کے لئے شروع سال (شوال) سے آخر سال (شعبان) تک، پس جب رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے تو جنت کے پتوں سے عرش کے نیچے گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والیاں حوروں پر ایک ہوا چلتی ہے تو وہ حوریں کہتی ہیں ''اے ہمارے پروردگار تو ہمارے لئے اپنے بندوں میں سے شوہر مقرر کردے تاکہ ان سے ہماری آنکھیں لطف اندوز ہوں اور ان کی آنکھیں ہم سے لطف حاصل کریں'' (بیہقی فی شعب الایمان)

رمضان المبارک کے سلسلے میں ایک کچھ طویل حدیث مبارکہ نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے اور اس حدیث پاک میں ماہ رمضان المبارک کے تمام فضائل کو احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں شعبان کے آخری دن میں خطبہ دیا پھر فرمایا ''اے لوگو! یقیناً تمہارے اوپر ایک عظیم اور مبارک مہینہ سایہ فگن ہے جس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار راتوں سے بہتر اور افضل ہے اس کے روزے کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے اور اس کی رات کے قیام کو نفل، جو شخص اس رات میں بھلائی میں سے ایک خصلت کے ذریعہ قربت (خداوندی) حاصل کرے تو وہ شخص اس آدمی کی طرح ہے جس نے ایک فریضہ کو ادا کیا ہو غیر رمضان میں، اور جس نے (رضائے الٰہی کے لئے) ایک فریضہ ادا کیا تو وہ آدمی ایسا ہے جیسا کہ اس نے ستر فریضے کو ادا کیا ہو غیر رمضان میں، اور وہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، اور بھائی چارگی کا مہینہ ہے اور وہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن بندے کا رزق بڑھایا جاتا ہے، جو شخص اس مہینہ میں کسی کو افطار کرائے تو اس کے لئے اس کے تمام گناہوں سے معافی اور اس کی گردن کی جہنم سے آزادی ہے اور اس کے لئے اتنا ہی اجر ہے جتنا کہ روزہ رکھنے والے کے لئے ہے اس کے اجر میں کچھ کمی کئے بغیر ہم (یعنی راوی حدیث حضرت سلمان فارسیؓ) نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے تمام آدمی ایسا نہیں ہیں کہ پائیں وہ چیز جس سے روزہ دار کو افطار کراسکیں، تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرماتا ہے جو کسی روزہ دار کو پانی ملائے ہوئے دودھ یا کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے ہی افطار کرائے، اور جو شخص کسی روزہ دار کو سیراب کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے ایک ایسا گھونٹ پلائے گا کہ (جس سے) اس کو دخولِ جنت تک پیاس نہیں لگے گی، اور وہ وہ مہینہ ہے جس کا پہلا حصہ رحمت ہے اس کا درمیانہ حصہ مغفرت ہے اور اس کا آخری حصہ جہنم سے آزادی ہے۔

(بیہقی فی شعب الایمان)

اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی ہے کہ خود ربِ دو جہاں نے ماہ رمضان المبارک کو اپنا مہینہ قرار دیا ہے جو اس مبارک مہینہ کی فضیلت وعظمت کا واضح اور بین ثبوت ہے اور ہر لحاظ سے قابل غور وفکر ہے کہ اس مبارک مہینہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی لگاؤ اور ایک خاص قسم کا تعلق ہے جس کا اندازہ کرنا مومن بندہ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ اس مہینہ کو عام مہینوں اور دنوں کی طرح گذار دے بلکہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اس کی فضیلت واہمیت سے آگاہی اور اس سے واقفیت کے بعد اس کا احترام کرے، اس کے فرائض وواجبات کو ادا کرے اور اس کے سنن ومستحبات کا اہتمام کرے اور عام دنوں سے زیادہ ہی اس مبارک مہینہ میں گناہ وعصیان، ناشائستہ، قبیح اور مذموم حرکات وسکنات اور اقوال سے گریز کرے تب ہی اس مہینہ کا ادب واحترام کما حقہ ادا ہوسکتا ہے اور تب ہی مومن بندہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا مستحق ہوسکتا ہے۔ اور اس ماہ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن مجید کا نزول اسی مہینہ میں ہوا ہے اور اسی ماہ کی آخری عشرہ کی کوئی بھی رات ''شب قدر'' ہوسکتی ہے۔ جس کو سورہ ''القدر'' میں ہزار راتوں سے بہتر اور افضل قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کا ذرہ مظاہرہ کیجئے کہ وہ رمضان المبارک جیسے عظمت وتقدس کی حامل پوری ماہ آسمان دنیا پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور گناہ گار، بیمار، قرض دار اور محتاج وضرورت مند کو پکار پکار کر بلاتا ہے اور اس کا دامن امید توقع سے زیادہ ہی بھر دیتا ہے۔ اور اس بات میں مبالغہ آمیزی نہ ہوگی کہ صرف روزہ ہی وہ عمل اور مخصوص عبادت ہے جس کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کریمی پر چھوڑ رکھا ہے۔ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بھلا جس کے اجر وثواب کا وعدہ اللہ تبارک وتعالیٰ جیسی عظیم ذات سے متعلق ہو اس کی خوش قسمتی اور نیک بختی کا کیا کہنا اور اس کا ٹھکانہ جنت کے علاوہ اور کہاں ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں رمضان المبارک کے احترام کرنے کی توفیق نصیب ہو اور یہ مبارک مہینہ بخیر وعافیت گذرے۔ (آمین)

(۲۵ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ)

*****

ماہِ رمضان، اس کی حیثیت اور اس کے مطالبے

رمضان ''رمض، یرمض'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی مٹانا، ختم کرنا اور زائل کرنا ہے، رمضان کو رمضان اس لئے کہتے ہیں کہ اس مہینہ میں اللہ رب العزت کی رحمتیں، برکتیں، فضیلتیں اور سعادتیں اہلِ ایمان اور مسلمانوں کے گناہوں اور معصیتوں کو ختم کر دیتی ہیں جو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور احسان ہے اور ساتھ ہی ان کو جہنم سے آزادی دلا کر جنت کی راہ پر لے جاتی ہیں۔

رمضان المبارک اسلامی کیلنڈر (سال) کا نواں مہینہ ہے اور سورج کی گردش کی وجہ سے اس کے موسم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کبھی موسمِ سرما میں پڑتا ہے، کبھی موسمِ گرما میں تو کبھی موسمِ برسات میں، لیکن یہی رمضان کا مہینہ اگر چاند کی گردش کے حساب سے متعین نہ کیا جاتا تو ہر سال، ہر زمانے اور ہر صدیوں میں ایک ہی موسم میں پیش آتا، صرف موسمِ سرما میں، صرف موسمِ گرما میں یا صرف موسمِ برسات ہی میں لیکن اس کا چاند کی گردش کے حساب سے متعین ہونا بندۂ مومن کے لئے ایک عظیم نعمت اور احسان ہے، وہ اس طور پر کہ اگر ماہِ رمضان المبارک صرف موسمِ سرما میں واقع ہوتا تو روزہ داروں کو اگر ایک طرف آسانی ہوتی کہ دن چھوٹا ہوتا اور زیادہ دیر تک روزہ رکھنا نہیں پڑتا تو دوسری طرف پریشانیوں کا بھی ان کو سامنا کرنا پڑتا کہ وقتِ سحر میں ان کو کھانے پینے میں دشواریاں ہوتیں، اسی طرح سے موسمِ گرما ہے کہ اس میں ایک طرف آسانی ہے تو اس کا دوسرا پہلو مشقت و پریشانی کو لیا ہوا ہے کہ دن کی طوالت، اس پر کڑاکے کی دھوپ اور آسمان سے آگ کی بارش ان کی بھوک اور پیاس میں شدت پیدا کر دیتی ہے اور آدمی کو جان کنی کی حالت تک پہونچا دیتی ہے اور موسمِ برسات بھی ان دونوں سے کچھ کم نہیں ہے کہ وہ بھی مزدوروں، کسانوں اور مہاجنوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے جس پر کہ اسبابی دنیا میں زندگی کا دارو مدار ہے اس لئے یہ موسم کی تبدیلی بھی انسانوں کے لئے رحمت ہی رحمت ہے اور تا کہ وہ ایک ہی موسم میں برابر روزہ رکھنے سے اُکتا نہ جائے (کیا ہی خوب ہے خدا کا نظامِ قدرت)

جب رمضان کا مہینہ آنے کے قریب ہوتا ہے تو ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی ہیں اور ہر طرف چہل پہل دیکھائی دیتی ہے، ایک طرف بچے خوش نظر آتے ہیں اور بوڑھے خدا کی حمد وستائش بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف نوجوانانِ امت بھی فرحاں وشاداں دیکھائی دیتے ہیں لیکن یہ مہینہ یوں ہی خوشیوں اور رنگ ریلیوں میں گذار دینے کا نہیں ہے کہ ہم جیسے چاہیں اس مبارک مہینہ کو گذرا دیں بلکہ اس کے بھی کچھ مطالبات ہیں، اس کے بھی کچھ فرائض وواجبات ہیں اور اس کے بھی سنن ومستحبات ہیں جن کی ادائیگی میں انسانوں کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

ماہ رمضان ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے؟

یہ اس ماہ کا ہم سے ایک اہم سوال ہے اور اس کے پسِ پردہ تمام اوامر ونواہی اور ان کے لوازمات آتے ہیں۔ رمضان ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اللہ رب العزت کی بندگی کا صحیح معنوں میں حق ادا کریں، اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں اور اس کے روکے ہوئے کاموں سے باز آجائیں اور اس ذیل میں وہ تمام قسمیں آجاتی ہیں جن کا تعلق اطاعت ومعصیت سے ہو یا وہ مسائل جو بندوں کی اپنی ذات سے متعلق ہوں اور عام طور پر مسلمان ان کا حق ادا نہیں کر پاتے ہیں وہ گناہوں سے باز نہیں رہ سکتے ہیں اور وہ اطاعتِ خداوندی کا حق ادا نہیں کر پاتے ہیں چنانچہ ''مشت نمونہ از خروارے'' کے چند مطالبے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

غیر روزہ دار کی ذمہ داری:

سب سے پہلے ان حضرات پر جو روزہ نہیں رکھتے ہیں چاہے اس کے ساتھ کوئی شرعی مجبوری ہی کیوں نہ ہو اور وہ معذور ہو جیسے مسافر، بیمار، حائضہ یا نفساء وغیرہ، ان کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ روزہ دار کے سامنے کھانے پینے اور اس جیسے کاموں سے پرہیز کریں، یہ نہ سوچیں کہ ہم تو روزہ سے نہیں ہیں، ہماری کچھ بھی ذمہ داری نہیں ہے اور ہم جیسے چاہیں کھائیں پئیں ہم سے شریعت کا کوئی مطالبہ ہی نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر لازم ہے کہ جب وہ کوئی چیز کھائیں تو پردہ کر کے تنہائی میں کھائیں تاکہ کسی دوسرے کا نفس کھانے پینے کی طرف مائل نہ ہو اور روزہ توڑنے کا وسوسہ دل میں پیدا نہ ہو۔

گناہ وعصیان سے اجتناب

مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس ماہ میں گناہ وعصیان، اختلاف ونزاع اور جھگڑا وفساد سے احتراز کرے اگر کوئی اس کے ساتھ بدسلوکی اور بدتمیزی کرے تو وہ اس پر صبر کرے اور انتقام کا جذبہ اپنے اندر پیدا ہونے نہ دے لیکن پھر بھی اگر کوئی ان کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنا ہی چاہے۔تو یہ اس سے معذرت کرے کہ بھائی میں روزہ سے ہوں میں جھگڑا کرنا نہیں چاہتا اور حتی المقدور گالی گلوج سے بھی اجتناب کرے نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم میں جو کوئی سب وشتم میں ابتداء کرے تو دوسرے کے سب وشتم کا گناہ بھی پہلے آدمی کو ہوگا (مشکوۃ) کتنی سخت وعید ہے گالی کوئی دے اور گناہ کسی اور کو ہو یہ صرف پہل کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے تا کہ کوئی سب وشتم میں پہل نہ کرے اور اس کا خاتمہ ہو جائے ایک دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ جب کوئی تم سے جھگڑا کرے تو تم اس سے کہہ دو کہ میں روزہ سے ہوں (مشکوۃ) گانا بجانا جس میں مسلمان عام طور پر مبتلا ہیں اس سے بھی احتراز کی سخت ضرورت ہے یہ عمل تو شیطانوں کا ہے اور اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے مزید برآں کہ یہ تضیع اوقات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس میں آدمی گھنٹوں گذار دیتا ہے اور اس کے دل میں خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم ضیاع اوقات میں مصروف ہیں اور ہم اپنے قیمتی اوقات کو گنوار ہے ہیں، اسی طرح سے غیبت، چغلی اور تہمت وغیرہ میں بھی مسلمان مبتلا ہیں غیبت کے مرتکب کو نبی ﷺ نے اپنے بھائی کا گوشت کھانے والا قرار دیا ہے اور خود قرآن میں اس کو اسی سے تعبیر کی گئی ہے فرمانِ الٰہی ہے ''اور تم میں کا بعض بعض کی غیبت نہ کرے کیا تم میں کا کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا، تو تم اس کو ناپسند کروگے'' (الحجرات: ۱۲) اور چغلی اور تہمت کا انجام تو بہت بھیانک ہوتا ہے جس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے غرض کہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنا چاہئے اور اس کا ارتکاب کر کے ربِ دوجہاں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔

کثرتِ اعمال:

اس ماہ میں کثرت کے ساتھ عبادت واستغفار اور اذکار واوراد وغیرہ کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ مہینہ تو اصل میں اسی لئے ہے کہ بندہ جتنا چاہے ثواب حاصل کرکے، عبادت واستغفار کر کے جنت کا حقدار بن جائے، جہنم سے آزادی حاصل کرلے اپنے رب کی خوشنودی اور رضا کا مستحق بن جائے اور

خصوصیت کے ساتھ سنن و مستحبات جیسے فرض نماز سے پہلے اور بعد کی سنت، طلوعِ شمس کے تقریباً بیس منٹ بعد نمازِ اشراق پھر اس کے تھوڑی دیر بعد نمازِ چاشت، نمازِ اوابین اور رات کی مشہور و مقبول نماز نمازِ تہجد وغیرہ کا اہتمام کرے اور اس کے علاوہ اپنے خالی اوقات کو دعا اور تسبیحات وغیرہ میں گذارے۔

اس کے علاوہ صدقاتِ نافلہ اور واجبہ کا اہتمام کرنا چاہئے اور روزہ داروں کو افطار وغیرہ کرانا چاہئے حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جو شخص اس ماہ میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کے لئے اس کے تمام گناہوں سے معافی ہے اور جہنم سے اس کی گردن کی آزادی ہے اور اس کو روزہ رکھنے والے کے برابر اجر ملتا ہے اس کے اجر میں کچھ کمی کئے بغیر'' (مشکوۃ: ۱۷۴، ترمذی: ۱/ ۱۶۶) اور یہ اجر و ثواب پیٹ بھر کر افطار کرانے پر موقوف نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب پانی کے ایک گھونٹ یا کھجور کا ایک ٹکڑا یا لسّی پر بھی عطا کر دیتا ہے۔

روزہ ایک اہم دینی فریضہ ہے:

روزہ بھی اس ماہ کے اہم مطالبوں میں سے ایک مطالبہ اور دینی فریضہ ہے اور یہ ارکانِ دین میں سے ایک اہم رکن ہے قرآن میں ہے ''تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے تو اس کے اوپر روزہ رکھنا لازم ہے'' (البقرہ: ۱۸۵) مگر یہ کہ کوئی مسافر، بیمار، حائضہ یا نفساء ہو جن کے اوپر روزہ لازم تو نہیں ہے البتہ رمضان کے بعد اس کی قضاء واجب ہے جس کی خود قرآن میں صراحت موجود ہے اور اس سلسلے میں روزہ سے متعلق ضروری مسائل کا جاننا فرض ہے جیسے کہ وہ افعال و حرکات جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے اسی طرح سے کس کام سے قضاء اور کفارہ دونوں واجب ہوتا ہے اور کس سے صرف قضاء۔

نمازِ تراویح :

نمازِ تراویح سنتِ مؤکدہ ہے رسول اللہ ﷺ نے ہر رمضان میں اس نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کیا ہے اور اس کی کل رکعتیں بیس ہیں جو حدیث سے ثابت ہیں (ترمذی: ۱/ ۱۶۶) اور ہمارے بعض احباب جو آٹھ رکعات کے قائل ہیں وہ بھی حدیث سے ثابت ہیں لیکن بیس رکعات کی تعداد پر عہدِ فاروقی میں اجماعِ صحابہ ہو گیا ہے جو دلیل شرعی میں سے تیسری دلیل ہے جس سے آٹھ کا قول مرجوح ہو گیا اور

یہ صرف اختلاف و انتشار اور نزاع کو ختم کرنے کے لئے ہوا تھا اور یہ کوئی بدعتِ فاروقی نہیں ہے جیسا کہ ہمارے بعض احباب کہتے ہیں اگر یہ بدعتِ فاروقی ہے تو جماعت کے ساتھ نماز تراویح بھی بدعت فاروقی ہونی چاہئے اس لئے کہ اس طریقہ کو بھی حضرت عمر فاروقؓ نے زندہ کیا تھا اور اس سے پہلے سب تنِ تنہا ہی اس نماز کو ادا کرتے تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے تمام صحابہ کرامؓ کو ابی ابن کعب کی قراءت پر اکٹھا کر دیا پھر جب دوسری رات ان سب کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ کیا ہی اچھی ہے یہ بدعت (بخاری: ۲۶۹/۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی حضرت عمر فاروقؓ کا ایجاد کردہ طریقہ ہے مگر وہ حضرات کہ جن کی آنکھ پر عصبیت کا پردہ پڑا ہوا ہے وہ ایک کو تو بدعتِ فاروقی قرار دیتے ہیں لیکن وہی لوگ دوسرے طریقے کو بلا چون و چرا قبول کرتے ہیں جس سے ان کی عصبیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ ماہِ رمضان المبارک کے چند مطالبات تھے جن کو مختصراً ذکر کیا گیا اللہ ہمیں اور سارے مسلمانوں کو اس ماہ کی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور کثرت عبادت ہمارا نصیبہ ہو اور گناہوں سے اجتناب ہماری عادت ہو۔

(۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ)

***

دعاء واستغفار کی رات

شب برات دراصل استغفار ومغفرت اور رحمتِ ایزدی کے متوجہ ہونے کی رات ہے اور یہی رات اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے نزول کی رات ہے اوراسی رات میں اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان دنیا پر تشریف لاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ ہے کوئی مغفرت کا طلبگار کہ میں اس کو معاف کردوں؟ ہے کوئی رزق کا متلاشی کہ میں اس کو رزق عطا کردں؟ ہے کوئی فریاد کرنے والا کہ میں اس کی فریاد رسی کروں اور طلوعِ صبحِ صادق تک یہی کیفیت رہتی ہے۔ (ابن ماجہ:۹۹) حدیثِ مبارکہ میں جس رات کی فضیلت واہمیت وارد ہوئی ہے وہ شعبان کی پندرہویں رات ہے، پندرہویں رات سے مراد وہ رات ہے جو چودہ تاریخ گذر کر آتی ہے، اس رات کے سلسلے میں اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس دن روزہ رکھو اور رات کا قیام کرو (ابن ماجہ:۹۹) یعنی نوافل وغیرہ پڑھا کرو گو کہ اس دن کا روزہ اور اس رات کا قیام امرِ استحبابی ہے لیکن اس سے اس رات کی فضیلت واہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس رات میں کونسی عبادت کرنی چاہئے تو اس بابت حدیث میں کوئی خاص عبادت منقول نہیں ہے کہ نوافل ہی پڑھے، تلاوت ہی کرے یا تسبیح وتہلیل ہی کرے بلکہ جس عبادت اور جس کام میں سہولت اور آسانی معلوم ہو اسی کو اختیار کرنا چاہئے البتہ بعض اسلاف نے اپنے مریدوں کو اس رات میں اس کے مزاج و مذاق کے مطابق خاص عبادت کی تلقین فرمائی تھی اور متعینہ رکعات کی نصیحت کی تھی جو اس کے لئے مفید اور بہتر تھا اور اس میں اس کے لئے سہولت اور آسانی مدنظر تھی۔

روایت میں آتا ہے کہ اس رات میں سال بھر کے تمام امور فرشتوں کے حوالے کردیئے جاتے ہیں حتی کہ اس سال کس کی موت اور کس کی پیدائش ہوگی اور کس کو کتنا رزق عطا کیا جائے گا وہ تمام لکھ دیئے جاتے ہیں، (مشکوۃ:۱۱۵) اس لئے مومن بندہ کو چاہئے کہ وہ اس رات کو عبادت واستغفار، ذکر و

تسبیح اور دعاء وغیرہ میں گذارے تاکہ اگر وہ اس سال مرنے والا ہو تو اس کے لئے جنت کا فیصلہ ہو جائے اگر فقر و فاقہ اس کی تقدیر میں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو فراخی عطا فرمائے اور اگر وہ لاولد ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اولاد مرحمت فرمائے، اس لئے کہ دعا ہی ایسی چیز ہے جو تقدیر کو بھی بدل سکتی ہے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''تقدیر کو دعاء کے علاوہ کوئی چیز ٹال نہیں سکتی ہے'' اگر چہ اس حدیث کے معانی و مفاہم پر محدثینِ عظام کلام کرتے ہیں لیکن پھر بھی بعض محدثینِ کرام نے اسی کو راجح قرار دیا ہے اور اسی پر اعتماد کیا ہے کہ دعا سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے، اس طرح سے مومن بندہ کو اس برات والی رات میں ایک خاص تحفہ عطا ہوا کہ وہ دعا کے ذریعہ اپنی مغفرت کرا سکتا ہے اور اولاد و رزق بھی طلب کر سکتا ہے۔

اس رات میں خصوصی طور پر قبرستان جاکر میت کے لئے دعا و استغفار کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں جو حدیث مروی ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس رات میں جنت البقیع تشریف لے گئے اور میت کے لئے دعا و استغفار کرنے لگے۔ (ترمذی: جلد ۱، صفحہ ۱۵۶) لیکن اس رات کو تزک و احتشام کے ساتھ گذارنا، مسجدوں میں اکٹھا ہونا اور جماعت اور گروہ کی شکل میں قبرستان جانا بھی درست نہیں ہے بلکہ خلوت اور تنہائی میں اکیلے ہی عبادت وغیرہ کرنی چاہئے اور تنہا ہی قبرستان جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جس چیز میں زیادہ فضیلت ہوتی ہے تو اس میں معصیت بھی دوسرے اوقات کے بالمقابل اور زیادہ اشد ہو جاتی ہے، جیسا کہ تصویر کشی بیرون مسجد گناہ ضرور ہے لیکن مسجد کے اندر تصویر کشی اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ رات بھی بابرکت اور فضیلت و اہمیت کی حامل رات ہے تو اس رات میں گناہ بھی اور ایام کے بالمقابل اشد اور سخت ترین گناہ ہوگا۔

اس رات میں گناہ دو قسم کے کیئے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو عبادت کی ہم شکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس برأت والی رات کے متعلق بوڑھی پرانی عورتوں کا وہم و گمان اور خیال ہے کہ اس رات میں مردہ کی روحیں اپنے گھر آتی ہیں اور اس کے لئے وہ عمدہ قسم کا حلوہ اور کھانا تیار کر کے تنہائی میں کسی اونچی جگہ پر رکھ دیتی ہیں تاکہ وہ اس سے کھائیں جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مومن بندے کی روحیں علیین میں پہونچادی جاتی ہیں اور علیین تو آسمانوں کے اوپر ہے پھر اس کے دنیا میں آنے کا سوال؟ لہٰذا ان کے یہ افکار و نظریات بھی باطل اور شیطان کی سازش کا نتیجہ ہے۔ (اللہ ہماری اس سے حفاظت فرمائے)

گناہ کی دوسری قسم جو اس رات میں کی جاتی ہے وہ عبادت کی ہم شکل نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی عبادت کا وہم و گمان

اور خیال دل میں گذرتا ہے بس یوں ہی تفریح اور دلی سکون واطمینان کے لئے یہ گناہ کیا جاتا ہے، اس کا برا اور فاسد ہونا تو بالکل ظاہر اور واضح ہے جیسے اس رات میں آتش بازی کرنا اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کبھی ہاتھ بھی جل جاتا ہے اور کبھی کبھار جانی اور مالی دونوں قسم کا نقصان ہوتا ہے چنانچہ یہ فعل تو معصیت ہونے کے علاوہ اپنے اندر دنیاوی نقصانات بھی لئے ہوئے ہیں۔

الغرض اس فضیلت واہمیت اور برات والی رات میں پوری ملتِ اسلامیہ کو چاہئے کہ وہ یہ رات عبادت واستغفار اور اطاعتِ خداوندی وغیرہ میں گذارے اور لغویات، فضولیات اور شیطانی اعمال سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا طالب ہو اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(۱۴؍ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ)

***

وہ ایک رات جو ہزار راتوں سے بہتر ہے

''بے شک ہم نے اتارا ہے اس (قرآن مجید) کو شب قدر میں، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر (کی فضیلت و اہمیت) کیا ہے، شب قدر وہ ہزار راتوں سے بہتر اور افضل ہے اس (رات) میں تمام فرشتے اور (بالخصوص) حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنے رب کی اجازت سے ہر معاملے کو لے کر اترتے ہیں سلامتی کے ساتھ، یہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ فجر طلوع نہ ہو جائے'' (سورۃ القدر)

اس سورہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک بہت زیادہ عابد شخص کا تذکرہ کیا کہ انہوں نے اسی (۸۰) سال مسلسل عبادت میں گذاری تو صحابہ کرامؓ کو بہت افسوس اور رنجیدگی ہوئی کہ ہماری عمر تو اتنی نہیں ہوتی پھر ہم میں سے کیسے کوئی ان کا مقابلہ کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القدر نازل فرما کر ان کی تسلی فرمائی کہ تمہیں گھبرانے اور فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے انہوں نے تو اسی (۸۰) سال میں اتنی عبادت کی تھی تمہیں تو ایک ہی رات کی عبادت اس کے مقابلہ کے لئے کافی ہے۔

سورۃ القدر قرآن مجید میں ترتیب کے لحاظ سے ستانویں نمبر پر ہے اور نزول سورہ کے اعتبار سے پچیسیویں نمبر پر اور اس کی کل آیتیں پانچ ہیں اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں نزول قرآن، شب قدر کی فضیلت و اہمیت اور اس کی انتہائے وقت کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور اہلِ سنت و جماعت میں سے کسی بھی فرقے کو اس رات کی فضیلت کے بارے میں کوئی شک و شبہ اور اختلاف نہیں ہے اور نہ رہے گا جب کہ شب برات کے بارے میں بعض کا اختلاف بھی ہے لیکن اگر کوئی اس میں اختلاف کی گنجائش پیدا کرے تو وہ ہماری جماعت اہلِ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور انشاءاللہ اس رات کی فضیلت و اہمیت پر قیامت کی صبح تک پوری امتِ محمدیہ کا اتفاق رہے گا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ شب قدر کس مہینے میں اور کس تاریخ کو پیش آتی ہے۔

تو شب قدر کے مہینہ کا تعین تو خود قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے ارشاد باری ہے''
رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے (البقرہ: ۱۸۵) اور یہی نزول قرآن کا دن شب قدر بھی ہے اور اس کی تائید کئی مشہور ومعروف احادیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جس کے نقل کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن الجھاؤ اور پریشانی کی بات اس کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں ہے اس لئے اس پر کچھ قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے، سورہ انفال کی آیت نمبر ۴۱ میں بیان کیا گیا ہے کہ''اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جس کو نازل کیا ہے ہم نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر فرقان (حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے یعنی غزوۂ بدر) کے دن جس دن کہ دو جماعتیں آپس میں ملیں'' اور مفسرین کرامؒ کے نزدیک یہ آیت بالاتفاق غزوۂ بدر سے تعلق رکھتی ہے جو سترہ رمضان المبارک کو پیش آیا تھا اور قرآن کا نزول بھی شب قدر ہی میں ہوا ہے لہٰذا نتیجتاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ شب قدر سترہ رمضان المبارک کو ہے اور اسی کو بعض مفسرینؒ نے راجح قرار دیا ہے لیکن دیگر جمہور مفسرین عظامؒ نے اس کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور فرمایا ہوسکتا ہے کہ مُنَزَّلُ (نازل شدہ چیز) سے مراد اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد ہو جسکی کہ دوسری جگہ صراحت موجود ہے پس سترہ تاریخ کا تعین بھی قابلِ یقین اور اعتماد نہیں رہا اور احادیث بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں اور اس سے اس کا تعین نہیں ہوسکا ہے احادیث میں صرف اتنا ذکر ہے کہ اس فضیلت والی رات کو رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو (بخاری: ۱/۲۷۰، مسلم: ۱/۳۷۰) یہ بھی واضح نہیں ہے البتہ ایک حدیث میں صرف اتنا ذکر ملتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے پاس شب قدر کی تعیین بتانے آرہا تھا کہ راستہ میں فلاں فلاں جھگڑ رہے تھے جس کی وجہ سے یہ تعیین اٹھالی گئی اور ہوسکتا ہے کہ تمہارے لئے اسی میں بھلائی ہو (بخاری: ۱/۱۲) وہ اس طور پر کہ اس رات کا متلاشی شب قدر کے بہانے اور دیگر رات بھی عبادت کر سکے گا اور اگر اس کی تعیین معلوم ہوتی تو وہ صرف اسی رات عبادت کرتا اور بقیہ راتوں کو عام راتوں کی طرح گذار دیتا لیکن جب اس کی تعیین نہیں ہوسکی تو لامحالہ اس کی عبادت میں پانچ رات کا اضافہ اور زیادتی ہوگی جو کہ مومن بندہ کے لئے نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر ہے۔

بعض صحابہ اور تابعین وغیرہ کا اس سلسلے میں ایقان ہے کہ یہ شب قدر ستائیسویں رات کو ہے جیسا کہ ابی بن کعب قسم کھا کر کہتے تھے کہ وہ ستائیسویں رات ہے اور عبد اللہ بن مسعود بھی اسی کے قائل تھے (ترمذی: ۱/۶۴، مسلم: ۱/۳۷۰) اس سلسلے میں آثار اور علامتیں بھی بتلائی جاتی ہیں کہ اس رات کی صبح

کو جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس میں شعاع نہیں ہوتا ہے (مسلم شریف) اور اس رات میں دریا کا پانی بہت زیادہ شیریں ہو جاتا ہے اور اس رات میں درخت بھی سجدہ کرتا ہے (اور اس کا سجدہ کرنا اسی کی کیفیت کے مطابق ہو جسکا کہ ہمیں ادراک نہیں ہو پاتا ہے جیسا کہ نماز میں سجدہ کے وقت بدن کے تمام اعضاء سجدہ کرتے ہیں لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا ہے) ''فضیلت کی راتیں'' نامی کتاب میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جس سے ستائیسویں رات کو تقویت پہونچتی ہے کہ ایک بہت بڑے بزرگ صاحب رمضان میں کسی جگہ کا سفر کر رہے تھے کہ اس درمیان انہوں نے ایک رات دریا کا پانی پیا تو اس رات میں وہ پانی ان کو بہت زیادہ شیریں معلوم ہوا جب کہ اس سے پہلے وہ اس دریا سے پانی پیتا تو وہ بہت زیادہ نمکین ہوتا تھا اور وہ ستائیسویں رات تھی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شب قدر کبھی ۲۱ ویں کو کبھی ۲۳ ویں کو کبھی ۲۵ ویں کو کبھی ۲۷ ویں کو اور کبھی ۲۹ ویں رات کو ہوتا ہو۔

آیت شریفہ کے ترجمہ میں یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ شب قدر میں تمام فرشتے مع جبرئیلؑ زمین پر اپنے رب کی اجازت سے تمام معاملے کو لے کر سلامتی کے ساتھ اترتے ہیں اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب تمام عبادت گذار بندوں کو سلام بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ خود رب دو جہاں بھی آسمان دنیا پر تشریف لاتا ہے اور مختلف طرح کے اعلانات کرتا ہے مگر اتنی ساری فضیلتوں اور اہمیتوں کے باوجود اس بابرکت رات میں بعض حضرات رحمت ایزدی سے محروم کر دیئے جاتے ہیں جس رات کہ خصوصی طور پر رحمت الٰہی کی مومن بندوں پر بارش ہوتی رہتی ہے اور ان محروم القسمت بندوں کی تعداد صراحت کے ساتھ حدیث میں بھی آئی ہے ان میں سے ایک مشرک ہے اور یہ تو ایسا شخص ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا'' جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے'' اور یہ محال ہے لہذا اس کا دخول جنت بھی محال اور ناممکن ہے اور دوسرا آدمی والدین کا نافرمان ہے کہ جو اس کی پیدائش کا سبب مجازی ہے قرآن وحدیث میں سختی کے ساتھ ایسے آدمی کو ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے اور ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے تیسرا آدمی شرابی ہے جس کی اس رات میں مغفرت نہیں ہوتی ہے اور شراب کے لئے تو حدیث میں ''ام الخبائث'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور اس کی بھی سختی کے ساتھ ممانعت وارد ہے اور اس کو سخت گناہ اور باعث لعنت قرار دیا گیا ہے، مزید برآں اس کا عادی جسمانی اعتبار سے بہت کمزور ہوتا ہے اور اس کی صحت بھی خراب ہوتی ہے۔

چوتھا شخص قطع تعلق کرنے والا ہے کہ اس کی بھی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی ہے اور

اس کے علاوہ بھی کئی قسم کے لوگ ہیں جو اس محرومیت میں شامل ہیں اور یہ رحمت ایزدی سے اسی وقت محروم ہو سکتے ہیں جبکہ وہ شب قدر سے قبل ہی اپنے اپنے گناہوں سے توبہ نہ کئے ہوں اور اگر یہ سب اس سے پہلے اپنے اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں تو پھر رحمت ایزدی کے ان کی طرف متوجہ ہونے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی ہے اور اس کی ہر طرح کی عبادت و استغفار، اذکار و تسبیحات اور دعا وغیرہ قبول کئے جاتے ہیں۔

(۲٦ر رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ)

***

عظمتِ کعبہ اور اس کے انوار و برکات

اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس نظام کائنات کے ہر ہر گوشے میں بڑائی ، بلندی اور تفوق پایا جاتا ہے ہمارا یقین کامل اور پختہ ایمان ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں اور شہروں میں مکہ مکرمہ سے افضل اور فائق و برتر کوئی شہر نہیں ہے اور اس کی فضیلت واہمیت کے بارے میں بہت سارے احادیث نبویہ ﷺ وارد ہیں جن سے اس کی فضیلت واہمیت اور اس کی عظمت و تقدس واضح ہوتا ہے اور جن سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ معظّمہ تمام شہروں سے افضل اور برتر شہر ہے خود رسول اللہ ﷺ کی اس شہر میں پیدائش کعبۃ اللہ کی موجودگی اور قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر اللہ تعالیٰ کا ''بَلَدِ اَمِیْنُ '' کہہ کر خطاب کرنا یہ سب باتیں اس کے بلندیٔ مقام اور عالی مرتبت ہونے کی واضح اور بین ثبوت ہیں مزید برآں کہ دین کا پانچواں اور عظیم رکن ''حج '' بھی اسی شہر میں ادا کیا جاتا ہے جس میں خانہ کعبہ کا طواف اور صفا ومروہ کے درمیان چکر لگایا جاتا ہے جو حج کے اہم ارکان میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو آب زم زم سے بھی نوازا ہے جو اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگار ہے تو دوسری طرف انعام خداوندی اور فضل رحمانی کا عظیم مشاہدہ بھی ہے اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اس پانی کو جس مقصد کے لئے بھی نوش کیا جائے تو وہ مقصد اس کو ضرور حاصل ہوگا اور اس کو ہر سال حجاج کرام کثیر مقدار میں احترام کے ساتھ اپنے دور دراز شہروں اور ملکوں کو لے جاتے ہیں۔

مقامِ ابراہیم

بیت اللہ کے اندر مقدس مقامات میں سے ایک مقام ابراہیم ہے جس کی عظمت و تقدس اور فضیلت قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور یہ وہ پتھر ہے جس پر چڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ تعمیر کعبہ کے وقت جب اینٹ اور گاڑھا

ڈالنے کے لئے اوپر چڑھنے کی ضرورت پڑتی تو وہ پتھر خود بخود اوپر اٹھ جاتا اسی طرح سے جب نیچے اترنے کی ضرورت پڑتی تو بھی وہ خود بخود نیچے ہو جاتا اور اس پتھر پر ابھی تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کے نشان جوں کے توں موجود ہے، گویا کہ یہ نظام قدرت کی ایک عظیم اور اہم نشانی ہے اور اسی جگہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو آیت قرآنی نازل ہوئی: ''اور مقام ابراہیم کو ناز پڑھنے کی جگہ بنالو'' (البقرۃ: ۱۲۵) اور اس طرح سے ہر حاجیوں کے لئے اس جگہ پر نماز پڑھنے کا وجوب ثابت ہو گیا۔

خانہ کعبہ پر رحمت الٰہی کا نزول

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نماز پڑھنے کے ثواب کے برابر اور مساوی ہوتا ہے اور یہ اس قدر اجر و ثواب اس لئے ہوتا ہے کہ یہ تجلی ربانی گاہ کا مرکز ہے اور اس پر ہر وقت، ہر آن، ہر لمحہ اور رات و دن اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر دن بیت اللہ پر سو رحمتیں ناز ہوتی ہیں اور پھر وہ سب پر تقسیم کر دی جاتی ہیں ان میں سے تیس رحمتیں طواف کرنے والوں کے لئے ہیں دس بیت اللہ میں نماز پڑھنے والوں کے لئے اور ساٹھ رحمتیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو صرف اپنی نظروں سے بیت اللہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور ہر وقت ان کے دل میں خانہ کعبہ سے جدائی کا احساس بڑھتا رہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ معلوم نہیں کہ اب میں گھر واپس جاؤں اور مجھے پھر یہاں دوبارہ حاضری کی سعادت ملے یا نہ ملے اور اس حسرت و یاس، دلی شوق و رغبت اور تڑپ کے ساتھ خانہ کعبہ کو اپنی نگاہوں سے افسوس کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے انعامات پہلے خانہ کعبہ ہی پر اترتے ہیں پھر دھیرے دھیرے سارے جہاں میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کے بالکل بیچ میں بنایا ہے اور بالکل اس کے اوپری آسمان پر بیت المعمور بنایا ہے جو فرشتوں کے طواف کرنے کی جگہ ہے اور اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور اس میں جو فرشتہ ایک مرتبہ داخل ہوتا ہے تو پھر اس کو قیامت تک اندر داخل ہونے کا موقع اور اس کی اجازت نہیں ملتی ہے اور اس کا ادب و احترام انسان کے علاوہ چرند و پرند اور دوسرے مخلوق بھی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کی چھت کے اوپر سے کوئی پرندہ تک نہیں گزرتا ہے۔

بانی کعبہ کی دعا اور اس کے آثار

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ ”مقامات مقدسہ“ میں تحریر فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”یہ ایک بدیہی اور مشاہدہ اصول ہے کہ بانی کا اثر بناء میں، صانع کا اثر مصنوع میں اور معمار کا اثر تعمیر میں آتا ہے۔ گویا تعمیر اپنے معمار کے افکار و جذبات اور نیات و ارادت کا مرقع ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مدینہ کے قریب ہی ”مسجد قبا“ کی بنیاد اللہ کے نبی ﷺ نے ڈالی جس کا حقیقی مقصد تقویٰ وطہارت اور اخلاص پر مبنی تھا جو بانی مقدس کے قلب مبارک میں موجزن تھا اس لئے اول و آخر اس سے تقویٰ و تقدس ہی کا ظہور ہوا اور اس مسجد کو تا ابد عبادت و ریاضت سے معمور کر دیا گیا۔“

قاری طیب صاحب ؒ آگے لکھتے ہیں ”اسی اصول پر مسجد حرام کو دیکھا جائے تو موجودہ عمارتِ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں چنانچہ انہوں نے اس مقدس کعبہ کے بارے میں جو دعاء مانگی تو وہ ان کے پاک قلوب کے انہیں پاک جذبات کی ترجمانی تھی جس سے اس خانہ کعبہ کی خصوصیات میں بھی اسی نوعیت کا فرق نمایاں ہوا جو بانیوں کی نسبت سے بھی نمایاں ہیں جس کی وجہ سے تو وہ گھر عبادت الٰہی کا مرکز بنا چنانچہ بانی کعبہ اور اس کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام نے معمار کعبہ کی حیثیت سے یہ دعا کی جو اس کی تعمیر کے وقت مانگی جا رہی تھی:

”اور جب کہ ابراہیمؑ واسماعیلؑ بیت اللہ کے پائے تعمیر کر رہے تھے (تو کہہ رہے تھے) اے ہمارا پروردگار یہ تعمیر ہم سے قبول فرما تو ہی ہے سننے والا، جاننے والا، اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنا ہماری اولاد میں ایک فرماں بردار امت بنا اور ہمیں ہماری عبادت کے راستے دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا رحمت والا اے ہمارے پروردگار اس (امت) میں ایک عظیم رسول اٹھا“ (البقرہ: ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اس پوری دعا کا حاصل بانی کعبہ کی طرف سے عبادتِ الٰہی کی آرزو، روحانیت کی طلب اور علم و اخلاق کا سوال ہے جو عبادت کا پہلا اور آخری عنصر ہے۔ بہر حال اس مقدس گھر بیت اللہ کی قدرتی ساخت و پرداخت میں چونکہ فطرتاً دین وایمان کا جذبہ کارفرما تھا تو وہی اس مسجد کی تعمیر اور معمار کی دعاؤں میں بھی نمایاں ہوا“ (مقامات مقدسہ: ۳۳۴ تا ۳۳۹)

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ ہمیں خانہ کعبہ کی زیارت نصیب فرمائے۔ آمین

(۱۲ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ)

اولاد کی پرورش اور تعلیم وتربیت

اولاد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بہت بڑا انعام اور عظیم نعمت ہے اور اس سے والدین کو راحت و آرام اور چین وسکون حاصل ہوتا ہے اور اولاد والدین کا بڑھاپے میں سہارا بنتی ہے اسی لئے ماں باپ پر اولاد کی حسن پرورش اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

چنانچہ جب بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ہو جائے تو اس کا اسلامی نام رکھا جائے اور عقیقہ کیا جائے (ابو داؤد: ۳۹۲/۲) روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا'' ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں'' (بخاری جلد ۱، صفحہ ۱۸۵) اور اگر اس کے والدین مسلمان ہوتے ہیں تو وہ اپنے بچے کو فطرت اسلام پر باقی رکھتے ہیں، ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ بچہ جب بولنے کے لائق ہو جائے تو اس کو کلمۂ توحید ''لا الـٰہ الا الـلـہ محمد رسول الـلـہ'' سکھایا جائے اور جب کلمہ توحید کہنے لگے تو اس کو چھوٹی چھوٹی قرآنی آیات سکھائی جائیں اور بچے کی پرورش کرنا والدین پر واجب ہے اور پرورش کی مدت لڑکے کے لئے نو سال اور لڑکی کے لئے بارہ سال ہے اتنی مدت پرورش کرنا والدین پر واجب ہے۔

شریعت نے والدین پر بچے کے تین حقوق رکھے ہیں۔ (۱) حلال رزق سے پرورش کرنا (۲) دینی تعلیم وتربیت (۳) اولاد جب جوان ہو جائے تو اس کی اجازت اور مرضی سے شادی کر دینا۔ یہ تین حقوق والدین پر واجب ہیں اور اگر یہ زندہ نہ ہوں تو اس کی پرورش کی ذمہ داری دادا پر ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو جو قریبی رشتہ دار ہوگا پرورش کی ذمہ داری اس کی طرف عائد ہوگی نیز بچے کی پرورش کرتے ہوئے اسلامی احکام کے مطابق دینی باتیں سکھائی جائیں۔

بچہ جب چھ سات سال کا ہو جائے تو اس کو کھانے کے طریقے سنت کے مطابق سکھائے جائیں جیسا کہ حضرت عمر بن ابی سلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی پرورش میں تھا اور میرے دونوں ہاتھ پلیٹ میں گھوم رہے تھے تو آپ ﷺ نے مجھ سے کہا'' اے بچہ اللہ کا نام لو اور اپنے دائیں ہاتھ سے

سامنے سے کھاؤ'' (بخاری: ۲/۸۰۹) آپ ﷺ کے بظاہر مخاطب تو عمر بن ابی سلمہ ہیں لیکن در اصل اس کے مخاطب تو تمام امت محمدیہ ہے اور آپ کا مقصد بھی امت کو تعلیم دینا تھا۔

شیخ سعدیؒ سے کسی نے پوچھا میں اپنی اولاد کو کس چیز کا حکم دوں، کیا سکھاؤں اور کیسے سکھاؤں؟ تو سعدیؒ نے فرمایا ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، علم دین سکھاؤ اور کسی نیک صالح استاد کے حوالے کر دو'' چنانچہ والدین پر اولاد کی پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ علم دین کا سکھانا واجب ہے اتنا کہ جس سے ارکانِ خمسہ ضروری اوامر ونواہی اور حلال وحرام وغیرہ کا علم ہو سکے یہ مقدار تو فرض ہے اور یہی اس حدیث ''طلب العلم فريضة على كل مسلم'' (ابن ماجہ: ۲۰) کا منشاء ہے، لیکن اگر کوئی اپنے بچے کو علم دین کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف راغب کرتا ہے تو اس سے یہ وجوب ساقط نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ علم تو علم ہی نہیں ہے بلکہ ہنر ہے جس طرح لوہار لوہاری کا ہنر سیکھ کر کمائی کرتا ہے اسی طرح عصری علوم سے دنیا کمائی جاتی ہے نہ کہ آخرت، لیکن اگر یہی علم دین خلوص وللہیت کے ساتھ حاصل کیا جائے تو آخرت سنورنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی بہت سارے فوائد سامنے آنے لگتے ہیں۔

ماں باپ جب بڑھاپے کی عمر کو پہونچ جاتے ہیں تو کسی مولوی سے آکر اپنی اولاد کی شکایت کرتے ہیں۔ اس موقع پر ابن خطابؓ کا واقعہ ہمارے لئے بڑا ہی درس آموز ہے چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے عہد خلافت میں ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر کہا، اے امیر المومنین میرا بیٹا میری بات نہیں مانتا ہے اور رات و دن مجھ پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے، امیر المومنین نے کہا تم اپنے لڑکے کو بلاؤ تو وہ شخص گھر واپس جاکر لڑکے کو لے کر آیا تو امیر المومنین نے لڑکے سے کہا کہ تیرے والد نے ایسا ایسا کہا ہے کیا یہ سچ ہے؟ تب لڑکا نے کہا اے امیر المومنین کیا اولاد کے حقوق والد پر نہیں ہیں؟ امیر المومنین بولے کیوں نہیں؟ تو اس نے کہا کہ تین حقوق (جو شروع میں گذر چکے ہیں) جو والد پر واجب ہیں ان میں سے کون سا حق اس نے ادا کیا ہے؟ اول اس نے میری تعلیم و تربیت نہیں کی، دوم اس نے حلال رزق سے میری پرورش نہیں کی، سوم اس نے (بالغ ہونے کے بعد) میری شادی نہیں کر دی نیز اس نے میرا نام بھی صحیح نہیں رکھا ہے بلکہ اس نے میرا نام ''جُعَلٌ'' رکھا ہے جس کا معنی گوبریلا کیڑا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کروں؟ تو اس واقعہ میں شکایت کرنے والے ہی کی شروع سے غلطی ہے اگر وہ اس کو علم دین سکھایا ہوتا تو آج وہ اپنے والد کو نہیں ستاتا بلکہ اس کی عزت واحترام کرتا اور خدمت کر کے اس کو راضی کرتا اور خوش وخرم رکھتا۔

دوسری بات یہاں پر یہ بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ علوم تو بہت سارے ہیں لیکن ان میں سے افضل ترین علم، علمِ قرآن پھر علمِ حدیث پھر علمِ فقہ ہے پس اگر اپنی اولاد کو قرآن کریم حفظ کرایا جائے تو اس کے دینی اور دنیوی دونوں فوائد برآمد ہوتے ہیں اور ان فوائد حسنہ میں سے جو فائدہ اعلیٰ ترین ہے وہ یہ کہ حافظ قرآن کے والدین کو قیامت کے دن آفتاب و ماہتاب سے زیادہ چمکدار اور روشن تاج پہنایا جائے گا اور جنت نصیب ہوگی اور کون ایسا ہے جو جنت کا خواہشمند نہ ہو لہذا والدین کو چاہئے کہ وہ اپنی اولاد کو حافظ قرآن بنائیں تا کہ انہیں بھی وہ تاج کل قیامت کے دن نصیب ہو (مسند احمد: ۴۴۰/۳۔ مشکوۃ: ۱۸۶) اور ہو سکے تو عالم و فاضل بھی بنائیں تا کہ ان کا ستارۂ قسمت مزید تابناک بن سکے۔

بچہ جب سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کا حکم دیں اور جب وہ دس سال کا ہو جائے تو نماز چھوڑنے پر اس کی ایسی پٹائی کریں جس سے مقصود ترغیب و تادیب اور ترہیب ہو اس لئے بطور تادیب ہلکی پھلکی تعزیر مناسب ہے، بیسویں صدی عیسوی کے مشہور عالم دین سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب ''القراءۃ الراشدۃ'' اول میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب میرے والد محترم نے حدیث ''علموا الصبی الصلوۃ الاخ'' سنائی تو میں نے کہا کہ ابا جان اب آپ کو کبھی بھی نماز پڑھنے کے لئے کہنا نہیں پڑے گا اور میں خود ہی نماز کی پابندی کروں گا چنانچہ حضرت مولانا اس کے بعد دوسرے صفحہ پر رقمطراز ہیں کہ جب لوگ بازاروں، ہوٹلوں، راستوں اور چوراہوں پر کھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ کھانے سے نہیں شرماتے اور جب کھلاڑی کھیل کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ کھیلنے سے نہیں شرماتے تو بھلا جب اللہ کی جانب سے نماز کا حکم آجائے تو میں نماز پڑھنے سے کیوں شرماؤں، اور بچہ جب دس سال کا ہو جائے تو اس کی خوابگاہ الگ کر دی جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے ''فرقوا بینھم فی المضاجع'' ان کے درمیان خوابگاہوں میں تفریق کردو۔

آج کا مسلم معاشرہ تنزلی اور پستی کی طرف اس قدر آگے بڑھا ہوا ہے کہ لوگ اپنی اولاد کو دیندار بنانا عیب سمجھتے ہیں اور پیدائش کے دن سے ہی اس کے لئے کافروں کی وضع قطع، طور وطریقے اور چال چلن پسند کرتے ہیں حالانکہ انہیں اپنی اولاد کو قرآن و حدیث اسلامی احکام و آداب اور اسلامی تعلیمات سکھانی چاہئیں لیکن چوں کہ انسان اپنے عواقب ونتائج سے بے خبر رہتا ہے جس کی وجہ سے علوم دینیہ کے بجائے ابتداء ہی سے عصری تعلیم دیتے ہیں اہلِ علم اور دینداروں سے دور رکھتے ہیں تو وہ بچہ سن شعور کو پہونچ کر نہ خدا کو جانتا ہے نہ رسول ﷺ کو اور نہ ماں باپ کی حیثیت کو سمجھتا ہے ان فیشن کے

پرستاروں کے نزدیک ماں باپ کی حیثیت گھر کے بوڑھے ملازم سے بھی کم ہوتی ہے اور یہ سب تو والدین کے کرتوت ہی کا تو نتیجہ ہے اور اولاد کے فساد و بگاڑ میں سب سے بڑا قصوروار مجرم والدین ہیں جنہوں نے اولاد کو فسق و فجور کی راہ پر ڈالا اور چلایا اسی لئے کل قیامت کے دن یہی بچہ اللہ سے کہے گا'' اے ہمارے پروردگار ہم نے کہا مانا اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا پھر انہوں نے ہمیں راہ سے گمراہ کر دیا اے ہمارے پروردگار ان کو دوگنا عذاب دیجئے اور اس کو اپنی رحمت سے بری طرح پھٹکارئے اور دور کیجئے'' (الاحزاب: ۶۷،۶۸) تب جا کر آنکھیں کھلیں گی اور حسرت کریں گے اور اس وقت حسرت کرنا کوئی کام نہ آئے گا اور نہ سود مند ہوگا لیکن اگر ماں باپ اولاد کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا ہوتا اور اس کی حسن تربیت کی ہوتی تو آج وہ دیکھتا کہ وہ اس کی عزت واحترام کررہا ہوتا۔

جو اولاد دینی تقاضوں سے دور ہوتی ہے وہ اولاد ماں باپ کے حقوق سے بھی بے خبر ہوتی ہے اور ایسی اولاد نہ زندگی میں ماں باپ کی عزت واحترام کرتی ہے نہ موت کے بعد ان کے لئے استغفار کرتی ہے نہ ان کے نام کا کوئی صدقہ دیتی ہے اور نہ ان کے لئے دعاء مغفرت کرتی ہے جن والدین نے اولاد کے دین و دنیا کو ناس کر دیا تو ان کو اولاد سے زندگی میں کچھ امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور نہ موت کے بعد صدقہ کا منتظر رہنا چاہئے۔

(۴ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ)

***

والدین کی رضا میں مخفی ہے پروردگار عالم کی رضا

تیری خدمت سے ہے دنیا میں عظمت میری
تیرے قدموں کے نیچے ہے جنت میری

یوں تو حضرت انسان کا دنیا میں وجود، پھر وجود کا ایک ایک ذرہ ہی خدا کی نعمتوں کا مظہر ہے۔ لیکن والدین خدا تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو دنیا کی ساری چیزوں سے بہتر اور محبوب ہے، بلکہ اللہ کی رضا والدین کی رضا میں مخفی ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''رضا الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد'' (ترمذی شریف)

یعنی خدا کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں ہے اور خدا کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔

والدین اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو اولادِ آدم کو دوبارہ عطا نہیں کیا جاتا ہے اور جو چیز جتنی عظمت و تقدس کی حامل ہوتی ہے، اس کا ادب و احترام بھی اسی لحاظ سے کیا جاتا ہے، والدین کی اسی فضیلت و اہمیت کی بناء پر ان کی خدمت و اطاعت کو حضرت انسان پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

ترجمہ: ''ہم نے انسان کو حکم دیا ہے ان کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا'' (العنکبوت:۸)

اس سے والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کا وجوب نہایت ہی واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

قرآن و احادیث میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی اتنی سخت تاکید آئی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو ذلت و خواری اور حقارت کی نظر سے دیکھنا گوارہ خاطر نہیں ہے اور شریعت اسلامیہ میں ان کا مقام و مرتبہ اتنا زیادہ ہے کہ ان کے حکم کو فرائض و واجبات کے علاوہ تمام نفلی عبادات اور امور پر ترجیح حاصل ہے، اس لئے ان کی اطاعت ہر حال میں کی جائے گی، ورنہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے بددعا کردیں اور وہ قبول ہو کر ہماری ذلت و خواری اور ہلاکت و بربادی کا سبب بن جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے والدین کی فضیلت واہمیت اور اس کا احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ترجمہ: ''اور حکم کر چکا تیرا رب کہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہونچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو اُف اور نہ جھڑک اور کہہ ان سے بات ادب کی، اور جھکادے ان کے آگے کندھے، عاجزی کر نیاز مندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا'' (بنی اسرائیل: ۲۳،۲۴)

چنانچہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ: ''ناک گرد آلود ہوا، ناک گرد آلود ہوا، ناک گرد آلود ہوا جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے کے وقت پایا، ان دونوں میں سے ایک کو یا دونوں کو پھر وہ جنت میں داخل نہیں ہوا'' (مسلم شریف: ۲/۳۱۴)

اس حدیث پاک کا مطلب ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس شخص پر افسوس فرما رہے ہیں جو اپنے والدین کو بڑھاپے کے وقت پائے پھر وہ خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہو سکے اور ایسا نہیں ہوا کہ وہ ان کی خدمت کر کے دخول جنت کا مستحق ہوتا۔ ناک گرد آلودہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذلیل وخوار ہوا، ایسے آدمی کی ذلت ورسوائی ہوئی اور ہلاکت وبربادی اس کا مقدر ہوا جس نے والدین کی خدمت نہیں کی۔

سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت کا ٹکڑا ''فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا'' سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مسئلے کا استخراج کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ والدین کو اُف کہنا حرام ہے، ان کو مزدوری دے کر کام کرانا، قصاص کے طور پر قتل کرنا اور کسی جرم کی سزا دینا بھی حرام ہے۔ اس لئے کہ آیت سے مقصود والدین کو ایذاء اور تکلیف سے بچانا ہے اور ایذاء کی علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہاں وہاں آیت کی روشنی میں حرمت ثابت ہوتی جائے گی (اصول الشاشی: ۳۰)

ماں کے اندر تین ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو باپ کے اندر مفقود ہیں جن کی وجہ سے ماں کی فضیلت واہمیت باپ کے بالمقابل زیادہ ہے اور وہ تینوں خصوصیات قرآن مجید کے سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں مذکور ہیں:

۱۔ حمل۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''حملته امه کرها'' کی وجہ سے۔

۲۔ وضع حمل اور اس کے شدائد وتکالیف۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وضعته کرها'' کی وجہ سے

۳۔ کم وبیش دو سالوں تک اپنے بدن کے گوشت و پوست، ہڈی اور خون سے تیار ہونیوالے

دودھ کی قربانی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان "وحملہ وفصالہ ثلثون شھرًا" کی وجہ سے۔

ماں کے اندر یہی وہ انفرادی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے ایک سائل سے اس کے دریافت کرنے پر تین مرتبہ ماں کو اپنی اولاد کے حسنِ سلوک کا زیادہ حقدار قرار دیا اور اس کے بعد چوتھی مرتبہ آپ ﷺ نے باپ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

اللہ تعالیٰ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی ارشاد نبوی ﷺ ہے: ترجمہ "تم اپنے باپ کے ساتھ حسن کرو، تمہاری اولاد تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کرے گی"

یہ بات ظاہری اسباب کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ جب تم اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے اور اس کو تمہاری اولاد دیکھے گی تو وہ یہ سبق حاصل کرے گی کہ ہمارے سماج و معاشرہ کا ایک حصہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا بھی ہے۔ باطنی اسباب کے لحاظ سے بھی یہ واضح ہے کہ جب تم اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں تمہاری اولاد کے دِلوں کو تمہاری طرف راغب کردے گا اور وہ تمہارے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے گی۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں کوئی ایسا کام کرنا جس سے والدین کو رنج وصدمہ اور تکلیف ہو اور وہ روئیں تو وہ گناہ اور حرام ہے اور ایسا کام کرنے والا شخص فاسق و فاجر ہے اور عذاب الٰہی اور لعنت نبویؐ کا سزادار ہے۔ اور ایسا کام کرنا جس سے وہ خوش ہوں اور وہ ہنسیں تو وہ ثواب کا کام ہے اور ایسا کرنیوالا شخص انعام خداوندی اور بشارت نبوی ﷺ کا مستحق اور حقدار ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا "بکاء الوالدین من العقوق" یعنی والدین کا رونا عقوق اور نافرمانیوں میں سے ہے اور جب اولاد کوئی ایسا کام کرے جس سے ان کو تکلیف پہونچے اور وہ روئیں تو وہ خدا کی ناراضگی کا سبب ہے۔

حضرت اویس قرنیؓ نے عہد رسالت ہی میں اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن وہ اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت میں مشغولیت کی وجہ سے بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضری نہ دے سکے اور شرف صحابیت سے محروم رہ گئے لیکن اس کے باوجود رسول اکرم ﷺ نے ان کے اس عمل پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس کی تحسین فرمائی اسی وجہ سے آپ نے فرمایا: "ان خیر التابعین یقال لہ اویس" بے شک تمام

تابعین میں سے سب سے زیادہ بہتر تابعی حضرت اویس قرنی ہیں ۔ (بخاری ومسلم)

ان کے اسی مقام ومرتبہ کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا کہ اگر تمہاری ملاقات اویس قرنیؒ سے ہو تو تم ان سے اپنے لئے مغفرت کی دعا ضرور کرانا ۔ (بخاری ومسلم)

سبحان اللہ! والدین کی خدمت کا کیا مقام ومرتبہ ہے وہ حضرت اویس قرنیؒ کے عمل سے ظاہر ہے اور ان کا یہ عمل حدیث مذکورہ ''رضا الرب فی رضا الوالد'' کا عظیم شاہکار، علمبردار اور اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔

اگر اولاد آدم کو مقام والدین معلوم ہوتا
تو وہ ان کے ہر ناز ونکھڑے کو باعث سعادت سمجھتی

لیکن جب سے دنیا نے ان کی قدروں کو گھٹا کر پیش کیا
تو ہائے زوال کہ مسلمان بھی ان کو معمر خانے تک لے گیا

(۱۲ر ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ)

***

صبر کشادگی کی کنجی ہے!

انسان کو جب کوئی تکلیف پہونچتی ہے یا اس کو کسی ناگہانی حالت کا سامنا ہوتا ہے تو ایسے وقت اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ جزع فزع شروع کر دیتا ہے اور دوسروں سے شکوہ شکایت کرنے لگتا ہے، جب کہ اس سے اس کو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی تسلی ملتی ہے اور وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ انسان اپنے عواقب ونتائج سے بے خبر اور ناواقف ہوتا ہے، لیکن اگر یہی انسان یہ سوچ لے کہ یہ اللہ کی طرف سے میری آزمائش اور امتحان تھا اور پھر اس پر صبر کرے تو اولاً اس سے اس کا غم ہلکا ہو جائے گا، ساتھ ہی وہ عنداللہ قابلِ تعریف بندوں میں سے شمار ہوگا اور اس کو یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اس کی جسمانی طاقت و قوت بحال رہتی ہے، اس لئے کہ غم واندوہ اور فکر و پریشانی کی وجہ سے روحانی اثر جاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے طاقت وقوت ختم ہوتی جاتی ہے۔

جب کوئی کسی مصیبت و پریشانی پر صبر کرتا ہے اور اس پر جزع فزع نہیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ایسے بندوں کے ساتھ شاملِ حال ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے ”یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“ (البقرۃ: ۱۵۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور دوسری طرف اس کی آخرت بھی بنتی اور سنورتی ہے، ایک حدیث قدسی میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مومن بندے کا میرے پاس کوئی بدلہ نہیں ہے جب میں ان کی دو محبوب چیز یعنی آنکھ کو سلب کرلوں پھر وہ اس پر صبر کر کے اللہ سے ثواب کی اُمید باندھے مگر میں اس کو جنت عطا کروں گا، (بخاری: ۲/۹۵۰) ایک دوسری جگہ نبی اکرم ﷺ نے مومن کی تعریف وتوثیق بیان کرتے ہوئے فرمایا ”مومن کا تمام معاملہ ہی عجیب ہے جو مومن کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں، اگر اس کو کوئی خوش کن بات پہونچتی ہے تو وہ شکریہ ادا کرتا ہے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر اس کو کوئی تکلیف دہ بات پہونچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لئے بہتر ہے“ (مسلم: ۲/۴۱۳)

بہرحال مومن کے لئے کسی بھی حال میں نقصان اور خسارہ نہیں ہے چاہے وہ تنگی میں مبتلا ہو یا

خوشحالی کی زندگی گذار رہا ہو، یہ بات ضرور ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں ضرور کامیاب ہوگا اور اگر دنیوی فائدے حاصل نہ ہوں تو اُخروی فائدے تو ضرور حاصل ہوں گے، بشرطیکہ وہ اس پر صبر کرے اس لئے کہ ہر کامیابی کے لئے کچھ نہ کچھ شرطیں ہوا کرتی ہیں۔

لیکن صبر کے یہ معنی نہیں کہ اس کو دلی تکلیف بھی نہ ہو اور اس کی آنکھ سے آنسو بھی نہ بہے، بلکہ صبر کا مطلب ہے کہ وہ لوگوں سے شکوہ شکایت نہ کرے اور نہ ہی رونا دھونا اور چیخنا چلانا شروع کر دے اور جہاں تک دلی تکلیف اور کسی ناگفتہ بہ حالت کے پیش آنے پر رَنج واَلم کا ہونا ہے تو یہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اور جس کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا کہ اس کے اندر انسانی فطرتوں میں سے ایک فطرت اور ایک خصلت کی کمی ہے اور یہ کمی انسان کے اندر ایک قسم کا نقص ہے جس کا کوئی مداوا نہیں، لہٰذا جس کے اندر یہ صفت پائی جاتی ہے تو گویا کہ وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک رحمت ہے جس پر اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، چنانچہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے اپنے بچہ کے انتقال پر نبی ﷺ کو بلا بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ اس پر صبر کرو لیکن جب انہوں نے دوبارہ قسم دے کر بلا بھیجا تو آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور آپ نے بچہ کو گود میں لیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ابھی صبر کی تعلیم دی تھی اور اب آپ خود رو رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ آنکھ سے آنسو بہنا صبر کے منافی نہیں ہے بلکہ آواز اور چیخ و پکار کے ساتھ رونا صبر کے منافی ہے اور یہ تو رحمت ہے۔

دوسری جانب صبر میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں جن کا تعلق حبس و منع سے ہے خواہ وہ طاعت کی قبیل سے ہو یا معصیت و مصائب کے لائن سے اسی بناء پر علماء نے صبر کی تین قسمیں کی ہیں (۱) صبر علی الطاعت (۲) صبر عن المعصیت (۳) صبر علی المصائب۔

صبر علی الطاعت کا مطلب یہ ہے کہ اطاعتِ خداوندی مثلاً نماز، روزہ وغیرہ میں جو روکاوٹیں حائل ہوں ان کو بالائے طاق رکھ کر نماز، روزہ کا ادا کرنا ہی صبر علی الطاعت ہے اور صبر عن المعصیت کا مطلب ہے کہ دل میں کسی گناہ اور حرام فعل کے ارتکاب کا داعیہ پیدا ہو پھر وہ خوفِ خدا اور خشیت الٰہی کی وجہ سے اس حرام فعل کے ارتکاب سے باز آجائے، اسی طرح سے صبر علی المصائب کا مطلب تو بالکل واضح ہے کہ کسی مصیبت و پریشانی اور ابتلاء وآزمائش کے وقت صبر کیا جائے۔

صبر مسلمانوں کے لئے تمام مصائب وآلام سے ڈھال اور تسلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس

سے ان کو چین وسکون اور راحت و آرام حاصل ہوتا ہے اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس کو خیال کر کے انسان آگے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، لیکن جب وہ مافات پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے اور صبر کا دامن نہیں پکڑتا ہے تو وہ نتیجۃً کم ہمت، بزدل اور سُست ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے اور اس کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ روز بروز کامیابی و کامرانی کے میدان میں پیچھے ہی ہوتا رہتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ کی تعلیم کے مطابق مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ جب بھی کسی کو کوئی مصیبت و پریشانی آپہنچے تو وہ نماز اور صبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرے اور ایسے لوگوں کو خوشخبری بھی سنائی گئی ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے ''اور ہم تم سب کو ضرور بالضرور آزمائیں گے خوف، بھوک، جان و مال اور پھلوں کی کمی میں سے کسی چیز میں مبتلا کر کے اور اے نبی! آپ صبر کرنے والوں کو بشارت وخوشخبری سنا دیجئے اور صابر وہ لوگ ہیں جن کو جب کوئی مصیبت پہونچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ '' (یعنی ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں ایک دن اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) (البقرہ: ۱۵۵، ۱۵۶) لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ مصائب و آلام کی گھڑی میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

(۸ر شوال المکرم ۱۴۲۳ھ)

***

امانت کی حقیقت واہمیت

اللہ تعالیٰ نے ''اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا'' (النساء: ۵۸) میں امانتوں کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے، کہ تم سب امانتوں کو امانت والے کے پاس واپس کردو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ادا نہ کرو اور آپسی اختلاف ونزاع اور بغض وعناد پیدا ہو جائے اور لڑائی کا طویل سلسلہ شروع ہو جائے اور قتل وغارتگری کا بازار گرم ہو جائے، نتیجتاً معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے، لیکن سمجھنا یہ ہے کہ امانت کیا ہے، اس کا حکم کیا ہے اور کیا کیا چیزیں ہیں جو امانت کے مفہوم میں آسکتی ہیں۔

امانت کا مفہوم

امانت ''امن'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے امن وآشتی اور چین وسکون کی زندگی گذارنا، امن ہی کے مشتقات میں سے ایمان بھی ہے، اس کا مفہوم بھی امن وآشتی اور چین وسکون کی زندگی گذارنا ہے، تو جس طرح سے ایمان معاشرہ کو بنانے اور سنوارنے کا موثر ذریعہ ہے، اسی طرح سے امانت بھی معاشرتی زندگی کے سدھارنے کا ایک کارگر آلہ ہے، اس لئے کہ جو چیز جس سے ماخوذ ہوتی ہے تو ماخوذ منہ کا اثر اور مادہ اس مشتق کے اندر ضرور پایا جاتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اس کے بنیادی مفہوم میں امن کا پیغام اور صلح وآشتی کا پیام پایا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدیہ کے علاوہ امن وامان کوئی دوسری شریعت وجود میں نہیں لاسکتی ہے، چنانچہ آئے دن مغرب امن وامان قائم کرنے کے جھوٹے دعوے کرتا ہے لیکن کہاں تک کامیاب ہو پاتے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اور اصطلاحِ شریعت میں امانت کہتے ہیں کسی شخص کا دوسرے شخص کے پاس کوئی چیز رکھنا، پھر اگر استعمال کرنے کی اجازت ہو تو یہ قرض کہلائے گا جس کے احکام الگ ہیں ورنہ وہ امانت ہے، پھر امانت کی تین قسمیں ہیں، (۱) امانت حقوق اللہ (۲) امانت حقوق العباد (۳) امانت العباد بانفسہم (حاشیہ جلالین: ۷۹)

حقوق اللہ کی امانت

اس کا دائرہ بہت وسیع ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے، مثلاً حقوق اللہ کی امانت یہ ہے کہ اللہ نے نماز کا حکم دیا ہے تو اب اگر بندہ نماز کو بغیر کم و بیشی کے ادا کرتا ہے تو اس نے اللہ کی امانت ادا کر دی۔ اسی طرح سے اللہ نے انسان کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ''اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے'' (التوبہ: ۱۱۱) اب مومنوں کو اپنی جانوں اور مالوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں رہا اور کسی قسم کے تصرف کی اجازت نہیں رہی کہ وہ اس میں تصرف کرے، لہٰذا انسان کے لئے اپنی جان و مال میں تصرف کرنا ناجائز اور حرام ہے لیکن اللہ رب العزت کا فضل و کرم اور احسان ہے کہ اس نے پھر یہ جان و مال بندے کے حوالے کر کے امانت رکھ دی کہ میں جن چیزوں میں جان و مال کے خرچ کرنے کا حکم دوں اس میں صرف کرنا اور جن چیزوں سے روکوں اس سے باز رہنا، اب انسان کی ذمہ داری ہے کہ جان و مال کو اللہ کی مرضیات پر چلائے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو میرے کلمہ ''لااله الا الله محمد رسول الله'' کی اعلاء کے لئے قربان کرو، لہٰذا انسان پر واجب ہے کہ وہ جان کو فی سبیل اللہ قربان کرے، نیز اللہ نے فرمایا ''لاتقتلوا انفسکم'' اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ''لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ'' تو مومنوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے نفس کی حفاظت کرے، یہی وجہ ہے کہ اپنے آپ کو مار ڈالنا، خودکشی کرنا اور اسباب موت کا اختیار کرنا حرام ہے۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جہاد کے لئے امیر بنا کر بھیجا تو ان کو ایک ٹھنڈی رات میں غسل کی ضرورت پڑ گئی تو انہوں نے تیمم کر کے نماز پڑھائی، جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا اور آپ نے دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے ''لا تقتلوا انفسکم'' تلاوت فرمائی تو آپ ہنس پڑے۔ (بخاری: جلد ۱، صفحہ ۴۹) اسی طرح سے مال کا مسئلہ ہے مثلاً زکوۃ، صدقات اور حج وغیرہ، اللہ نے ان سب راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، تو ان سب راستوں میں خرچ کرنا اور حج کرنا فرض ہے اور ناجائز اور حرام کام مثلاً زنا کاری، فلم بازی، رشوت دہی اور حرام اشیاء کی خرید و فروخت میں صرف کرنا امانت کے بجائے خیانت ہے جو حرام ہے لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جان و مال کی ملکیت یہ دراصل اللہ کی امانت ہے، اس کو اللہ کے حکم

کے مطابق صرف کرنا چاہئے۔

حقوق العباد کی امانت

امانت کی دوسری قسم حقوق العباد ہے اور اس میں خیانت کیا جانا بندہ کے معاف کئے بغیر کوئی چارہ اور تدبیر نہیں، حقوق اللہ تو اللہ تعالیٰ معاف کرسکتا ہے لیکن حقوق العباد معاف نہیں کرسکتا اس لئے کہ اس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی مثال جیسے والدین، اساتذہ، اقرباء، غرباء اور پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت ہے، والدین کے حقوق تو یہ ہیں کہ جان و مال سے ان کی خدمت کی جائے، ان کو خوش وخرم رکھنے کے لئے ہر قسم کے شرعی جتن کئے جائیں، اسی طرح سے اساتذہ کے حقوق یہ ہیں کہ تعلیم وتربیت سے متعلق جو بھی ان کی رہنمائی ہو اسے بجالائے اور ان کی حدود شرع میں رہتے ہوئے ہر قسم کی خدمت کی جائے۔ رہا اقرباء تو ان سے تعلق کو برقرار رکھنا اگر آپ مالدار اور صاحبِ وسعت ہیں تو ان کا مالی تعاون کرنا، زکوۃ کے مصرف میں سے ایک اقرباء مساکین بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو زکوۃ کا مال دینا دوہرے اجر کا باعث ہے، ایک زکوۃ کا دوسرا صلہ رحمی کا اور اس سے تعلقات میں استقامت واستواری پیدا ہوگی اور اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ سے خوش بھی رہیں گے اور آپ کے لئے دعاءِ خیر کرتے رہیں گے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''قریبی رشتہ داروں کو صدقہ دیا کرو کہ وہ دوہرے اجر کا باعث ہے ایک صدقہ کا دوسرا رشتہ داری کا'' (بخاری: جلد ۱، صفحہ ۱۹۸) اور رشتہ داروں میں سے زیادہ حقدار اور پہلا مستحق وہ ہے جو آپ کے گھر سے زیادہ قریب ہو (بخاری: ۲/۸۹۰) لیکن صدقہ صرف اموال کے ذریعہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر بھلی بات بھی صدقہ ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کل معروف صدقة'' (بخاری: ۲/۸۹۰) ہر طرح کی بھلائی صدقہ ہے خواہ زبان کے ذریعے ہو یا اعضاء وجوارح کے ذریعے، بھلی بات کہنا اور نرمی سے کلام کرنا اسی طرح سے کسی کا کوئی کام کر دینا اور اس کے لئے کہیں جانا بھی صدقہ ہے۔

اسی طرح سے پڑوسی کے بھی حقوق اسلام نے متعین کیا ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، پڑوسی کے تین درجے ہیں۔ ایک رشتہ دار مسلم پڑوسی، دوسرا اجنبی مسلم پڑوسی، تیسرا غیر مسلم پڑوسی خواہ وہ اجنبی ہو یا غیر اجنبی۔

تو پہلے یعنی رشتہ دار مسلم پڑوسی کے تین دو حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اول رشتہ داری کا دوم مسلمان

ہونے کا، سوم پڑوسی ہونے کا۔

دوسری قسم یعنی اجنبی مسلم پڑوسی کے دوحقوق عائد ہوتے ہیں۔ اول مسلمان ہونے کے ناطے، دوم پڑوسی ہونے کے ناطے۔

تیسری قسم یعنی غیر مسلم پڑوسی کا صرف ایک ہی حق عائد ہوتا ہے۔ صرف پڑوسی ہونے کا۔

تو ان میں سے ہرایک قسم کی پڑوسی کے لئے خیر خواہی کرنا، ان کی دیکھ بھال کرنا اور اگر وہ بھوکا ہے اور اللہ نے آپ کو وسعت دی ہے تو بقدرِ ضرورت اس کو دینا یہ سب چیزیں علی حسب المراتب پڑوسی کے حقوق میں داخل ہیں۔

نفس کی امانت

امانت کی تیسری قسم امانة العباد بانفسھم ہے اور یہ امانت بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس قسم میں وہ تمام حقوق آتے ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا یا سننا، طعن وتشنیع کرنا اور چغلخوری کرنا اسی طرح ہاتھ سے کسی غلط چیز کا انجام دینا، آنکھوں سے غیر محرموں کا دیکھنا اور پیر کا غلط استعمال کرنا اسی طرح منھ کا زنا کسی عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ کرنا اور شہوت رانی والے لطائف اور قصص وغیرہ کا بیان کرنا ہے اسی طرح سے آنکھ کا زنا غیر محرموں کو دیکھنا ہے اور ہاتھ کا زنا غیر محرم کے اعضاء کو چھونا ہے اور دل کا زنا کسی غیر محرم کا خیال دل میں لانا اور اس پر تبصرہ کرنا ہے اور پیر کا زنا زنا کی طرف چلنا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدمؑ پر زنا میں سے اس کے حصے کو لکھ دیا ہے جس کو وہ یقینی طور پر کر کے رہے گا تو آنکھ کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا بولنا ہے، نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور فرج اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی تکذیب کرتا ہے (بخاری: جلد۲، صفحہ۹۲۲) یہ ہے امانت کی تینوں قسموں کی مختصر اور اجمالی تفصیل۔

مؤتمن الیہ کی ذمہ داری

البتہ امانتِ مالی میں امانت رکھنے والے کے ذمہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ جو سامان رکھ رہا ہے اس کو مع تاریخ لکھ لے اور دو گواہ بھی بنالے اور جس کے پاس امانت رکھی جارہی ہے، اس کے لئے

ضروری ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور مالک کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف نہ کرے اور اگر ضرورت پڑ جائے تو صاحبِ مال سے اجازت حاصل کرلے اس کے بعد اس سے استفادہ کرے۔ ایک صحابی رسول حضرت زبیرؓ کا واقعہ ہے کہ لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے تو وہ کہتے بھائی: مجھے قرض دے دو امانت نہ رکھو اور بعد میں سارا مال اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دیا کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ جب ہجرت کی رات مکہ سے نکلنے لگے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے مبارک بستر پر لٹا کر یہ کہہ کر نکلے کہ یہ مال لو اور صبح تم فلاں فلاں کو امانت واپس کر دینا اور ناموں کی ایک فہرست بتادی، یہی وہ بنیادی چیز تھی کہ ہزار دشمنی کے باوجود لوگ اپنی اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس ہی رکھا کرتے تھے اور اسی وجہ سے اہلِ مکہ آپ کو "الامین" کہہ کر پکارتے تھے قرآن کریم نے سچ فرمایا ہے "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ" (الانبیاء: ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو سارے جہاں کے واسطے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

شیخ ابوعثمان الحیریؒ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں وہ اپنا واقعہ خود ہی بیان فرماتے ہیں کہ لوگ میرے پاس امانت میں اپنی باندیاں بھی رکھا کرتے تھے ایک مرتبہ نیشاپور کے ایک تاجر نے اپنی باندی میرے پاس امانت رکھ دی اتفاقاً ایک دن میری نگاہ اس باندی پر پڑ گئی اور میں اس سے عشق کرنے لگا، جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے اس پر افسوس بھی ہوا تو میں اپنے شیخ کے پاس گیا اور انہوں نے اپنے شیخ کے پاس مجھے بھیجا اور اس کے بعد میری اصلاح ہوئی (نفحۃ العرب از مولانا اعزاز علی امروہیؒ)

ادائے امانت حکمِ خدا برائے بندہ است
برایں من عمل نہ کند برائے آں عتاب است

(۲۹ر جمادی الاول ۱۴۲۳ھ)

***

حکومتِ ہند اور جمہوریت

یہ محاورہ ہی نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت ہے، نیز یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں اور ظاہر و باہر ہے کہ ''درخت لگائے کوئی اور پھل کھائے کوئی'' لیکن افسوس تو اس پر ہے کہ وہ درخت لگانے والے کا شکریہ بھی ادا نہ کرے، حالانکہ دنیا کا یہ دستور رہا ہے اور حکومت کا یہ آئین رہا ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسان کو بھلاتے نہیں، وہ ان کا احسان مند ہوتا ہے اور وہ احسان فراموشی کا ارتکاب نہیں کرتے، لیکن آج کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے سب سے بڑے محسن مجاہدین جنگِ آزادی علماء کرام اور ان کے روح پرور کارنامے کو بھلا دیتے ہیں، گویا کہ انہوں نے اس میں حصہ لے کر کوئی کارنامہ انجام ہی نہ دیا ہو، جب کہ تاریخِ ہند اس کے خلاف شہادت دیتی ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بے شمار علماء کرام اور اہلِ ایمان نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، اسی جنگ کے بعد تقریباً پندرہ ہزار علمائے کرام شہید کردیئے گئے، دہلی کے چاندنی چوک سے درّ خیبر تک تمام درختوں پر علماءِ کرام کی گردنیں لٹک رہی تھیں۔

اس چمنستان کو اپنے خونِ جگر سے کس نے سینچا؟ اس پر اپنی جانوں کی قربانی کس نے پیش کی؟ اس کے پھل اور ثمرہ سے فائدہ کون اٹھا رہا ہے؟ اور مستفیذ و بہرہ ور کون ہو رہا ہے؟ تیرھویں صدی ہجری جب اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی، مغلیہ حکومت کے ساتھ اسلامی شان و شوکت کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا، اس سرزمینِ ہند پر کتوں، لومڑیوں اور مکاروں کا استبدادی قبضہ جمتا چلا جا رہا تھا، اسلامی مدارس و مساجد کے انہدام کا عمل شروع کیا جا چکا تھا، عورتوں کی عفت و عصمت کو تار تار کیا جا رہا تھا اور انسانی خونوں کی ہولی کھیلی جا رہی تھی...... انہی حالات کو بھانپتے ہوئے علماءِ کرام نے جنگِ آزادی کا اعلان کیا تھا، پھر ہندوستان کے دارالحرب ہونے، انگریزی فوج میں بھرتی ہونے کے حرام ہونے اور جہاد کا اعلان ہی ایسا تھا کہ جس کے نتیجہ میں پہلی جنگِ آزادی کا واقعہ رونما ہوا تھا، جو جنگ خالصتاً مسلمانوں نے لڑی تھی اور اس میں کوئی بھارتی شامل تھا اور نہ ہندی، بلکہ دوسری جنگِ آزادی کے موقع پر تو آر، ایس، ایس انگریزوں کا موافق اور ان کا

حمایتی تھا۔

اس بات کی شہادت خود انگریزوں کی زبانی سنئے جو ایک گورنر نے اپنے بڑے حاکم کو لکھا تھا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بیدار مغز مسلمان ہیں اور جب تک ہندوستان میں یہ مسلمان باقی رہیں گے اس وقت تک ہندوستان میں ہماری حکومت قائم نہیں ہوسکتی ہے اور یہ جنگ خالصتاً انہوں نے ہی لڑی ہیں اس لئے ان کے دل سے سب سے پہلے جذبۂ جہاد کو ختم کر دیا جائے، اسی رپورٹ کے نتیجہ میں مرزا غلام احمد قادیانی اور مولوی احمد رضا خاں بریلوی کو انگریزوں نے زرخرید غلام بنایا، مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد جیسی اہم عبادت کو حرام قرار دیا اور کہا کہ اللہ نے مجھے نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے اور یہ وحی بھیجی ہے کہ اب جہاد کی حلت اٹھالی گئی ہے اور جو میری تکذیب وتکفیر کرے وہ واجب القتل اور کافر ہے اور مولوی احمد رضا خاں نے کہا کہ ہند دارالاسلام ہے اور دارالاسلام میں حکومت کے خلاف جہاد اور بغاوت کرنا حرام ہے، لہٰذا انگریزوں کی حکومت کے خلاف جہاد کرنا حرام ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزوں کی حکومت اللہ کی رحمت ہے، لہٰذا اس کی قدر کرنی چاہئے اور ایک تیسری جماعت غیر مقلدوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان سے اپنے لئے وہابی کے بجائے اثری کا سرٹیفکٹ حاصل کیا اور تھوڑے ہی دِنوں بعد اثری کے بجائے اہلِ حدیث کا لقب اپنے لئے الاٹ کروالیا، جو حدیث نبوی ﷺ کے حامل تو نہیں تھے ہاں احادیث انگریز کے اطاعت گذار اور فرماں بردار ضرور تھے...... بہر حال ان تینوں جماعتوں نے امتِ مسلمہ ہند کو اختلاف وانتشار کی راہ پر ڈالا اور ان کو ٹکڑیوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔

جب سلطان ٹیپو شہید علیہ الرحمۃ انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے، تو ان کے مقابلہ کیلئے انگریزوں نے میر صادق کو تیار کیا اور انہوں نے اس کی مدد سے سلطان ٹیپو شہیدؒ کو زیر کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، اسی طرح سے انگریزوں نے بنگال کے سراج الدولہ کو ختم کرنے کے لئے میر جعفر کو غدار بنا کر کھڑا کیا اور انگریز ان کو بھی پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے (تمام شہیدان آزادی اور ان دونوں کو تہہِ دل سے ہم اہلِ وفا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں) اور یہ دونوں حضرات شہید ہو کر اس فرمان الٰہی "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" (آلِ عمران: ۱۶۹) کے مصداق ہو گئے۔

اگر اپنوں کی غداری نہ ہوتی تو آج ہم غیروں کی باطل حکومت کی ماتحتی میں نہیں ہوتے، لیکن کیا کیا جائے خدا کا فیصلہ ہی یہی تھا کہ ہماری حکومت ختم ہو اور غزوۃ الہند کے بعد دوبارہ اسلامی حکومت قائم

ہو کر اس محاورہ کی صداقت سمجھ میں آئے کہ " اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" اور چوں کہ ہمارے برادرانِ وطن جنگِ آزادی میں اصولاً الگ رہے، لیکن جب ہندوستان کی آزادی کے بعد حکومت سازی کا مسئلہ اٹھا، تو پاکستان الگ ہو چکا تھا، اس لئے مسلم اکثریت اب اقلیت میں آچکی تھی، لہٰذا حکومت کی باگ ڈور برادرانِ وطن نے سنبھالی، لیکن نظام حکومت جمہوریت کا قائم ہوا اور دستورِ ہند میں یہ بات درج ہوئی کہ ہندوستان میں تمام مذاہب کے رہنے والے برابر درجہ کے شہری ہیں اور وہ سب آپس میں مل جل کر بھائی بھائی بن کر زندگی گذاریں گے اور کسی کے اوپر ظلم وزیادتی نہیں کی جائے گی۔ اب ان چند جملے کو بغور پڑھئے اور جمہوریت کا تقابل کیجئے۔

○ ۱۹۴۹ء میں شر پسندوں نے بابری مسجد میں مجسمہ نصب کر دیا اور حکومتِ ہند اس کو وہاں سے ہٹا نہ سکی اور الٹے مسجد کو مقفل کر دیا۔

○ ۱۹۸۵ء میں شہر حیدرآباد کی چار مینار مسجد جو قلب شہر میں واقع ہے سے چند آدمی نے کود کر خودکشی کر لی تو ہائیکورٹ نے مسجد کو مقفل کر دیا، اس کے ساتھ ہی مسجد کی مشرقی اور جنوبی جانب ستون سے لگ کر ایک مندر بھی تعمیر کر دی گئی ہے اور اس کے پاس پولیس بھی تعینات کر دی گئی ہے اور اب تو اس کو تفریح گاہ میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

○ ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور میں مسلمانوں کا قتلِ عام، ان کی عورتوں کی عفت وعصمت پر ڈاکہ زنی، کیا انسانی تقاضہ کے مناسب ہے؟

○ ۱۹۹۲ء میں شر پسند عناصر نے بابری مسجد کو شہید کر دیا اور اس پر حد یہ کہ اسی سن میں ممبئی کے مسلمانوں پر قیامت ڈھادی گئی اور یہ سب کانگریسی حکومت کا زمانہ ہے جو سیکولرزمی دعوے میں مشہور ہے۔

○ ۲۰۰۱ء میں کانپور میں زبردست فساد بھڑکا اس کے بارے میں حکومت نے کیا اقدام کیا؟ الٹے حکومت کی جانب سے مسلمانوں پر الزام اور مصائب ومظالم کیا جمہوریت کے منافی نہیں ہے؟

○ ۲۰۰۲ء میں گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کہ اس میں زندہ انسانوں کو جلایا گیا، مسلمانوں کے املاک کو لوٹ کر آپس میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کی گئی، ان کے مکانات ودکانات کو نذرِ آتش کیا گیا، چالیس چالیس کارسیوکوں نے ایک ایک عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کر کے زندہ آگ میں جلا دیا، چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے سامنے ان کے ماں باپ قتل کر دیئے گئے اور کئی مساجد منہدم کر کے راتوں رات بلڈوزر چلا کر پولیس کی نگرانی میں سڑک بنا دی گئیں اور حکومتِ گجرات خاموش تماشائی

بنی رہی اور حکومتِ ہند بھی اس کی برطرفی کے تمام مطالبوں کو مسترد کرتی رہی، حتی کہ حکومتِ ہند نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر گودھرا کا واقعہ پیش نہ آتا تو گجرات میں فسادات پر قابو کر لیا جاتا اور یہ تو ردِ عمل تھا۔

O کیا یہ سب واقعات ان اشعار کے موافق ہیں؟

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

تارادت نرویرودھا کہتے ہیں۔

ہندو مسلم ، بھائی بھائی یہی ہمارا نعرہ
سِکھ عیسائی سب ہیں بھائی ، ہم نے یہی وچارا

ان چند واقعات وشواہد سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتِ ہند مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتی ہے اور ہندوتوا کا علم لہرانا چاہتی ہے، خواہ حکومت کسی کی ہو، غرض کہ مسلمان کسی بھی حکومت سے مامون نہیں ہے، نہ ہی حکومتِ کانگریس کے زمانہ میں اور نہ ہی بی جے پی کی حکومت کے زمانہ میں اس لئے کہ بھاگلپور، یوپی، اور رانچی وغیرہ کے فسادات اور بابری مسجد کا انہدام حکومتِ کانگریس کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور بی جے پی کا زمانہ تو آپ کے سامنے ہے کانپور اور گجرات وغیرہ میں فسادات تو انہی کے دورِ حکومت میں ہوئے ہیں، غرض کہ کوئی بھی سیاسی پارٹی اور جماعت مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ کبھی کبھار کوئی پارٹی اپنی پوشیدہ مفاد پرستی کی خاطر مسلمانوں کا ساتھ دے دیتی ہے اور کبھی تو حقیقت زبان پر آ ہی جاتی ہے، اس لئے مسلم تنظیموں، قائدینِ ملت اور علماءِ کرام کو چاہئے کہ وہ موجودہ حالات کے تناظر میں مستقبل کی تعمیر کریں اور اپنی اولاد کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ سائنس وٹکنالوجی سے بھی آراستہ کریں اور خود بھی ہند میں سلطنتِ الٰہی کے قیام اور جہاد کے لئے تیار ہو جائیں اور اپنے بچوں کی ذہنی تربیت اس طرح کریں کہ وہ ہر حالت میں دین اسلام پر قائم رہیں اور وہ کہیں "رضینا بالله ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا" کہ ہم اللہ سے رب ماننے کے اعتبار سے راضی ہیں اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے اور محمد ﷺ سے نبی ہونے کے اعتبار سے، خواہ حالات موافق رہیں یا ناسازگار، اگر گردن جھکائے تو صرف اسی کی بارگاہ میں جھکائے خواہ گردن کٹانی پڑے یا زندہ آگ میں کودنا پڑے، لیکن دینِ اسلام سے مرتد نہ ہوں۔

***

قومی پرچم اور ہندوتوا سازش

ہمارا ملک ہندوستان جو جمہوریت کا علمبردار ہے، جہاں سیکولر ازم کا نظام کارفرما ہے، جس کا قومی پرچم تمام ہندوستانیوں کے افکار و جذبات اور عزائم و حوصلے کا غماز ہے، وہ اب ہندوتوا نظریے اور اس کے افکار سے بھی محفوظ نہیں رہ سکا، اس میں تصرف کیا جانے لگا، اس کی علامتوں اور نشانیوں کو مٹایا جانے لگا، جنگِ آزادی کی تاریخ کو مسخ کیا جانے لگا، اس کے ذریعے ہندوتوا افکار و نظریات کو عام کیا جانے لگا اور اس پر ہندوتوا رنگ رنگا جانے لگا۔

ایسے میں جنگِ آزادی کے مجاہدوں اور اس کے شرکاء یا ان کے جانشینوں کا کیا فریضہ بنتا ہے اور ان کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ اس کو محسوس کریں اور وہ جنگِ آزادی کی تاریخ کو مسخ ہونے سے بچائیں، قومی پرچم جو جنگِ آزادی کی یادگار ہے، اس میں تصرف کئے جانے سے بچائیں، اس میں جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، اس کا دِفاع کریں اور وہ افکار و جذبات جو اس کے اندر پنہاں ہیں ان کو باقی رکھتے ہوئے اپنی اگلی نسلوں تک منتقل کریں، اس سے ہمیں جو سبق ملتا ہے اس کو مستقبل کے فرزندوں تک پہونچائیں، ورنہ تو تاریخ ہمیں نہیں بخشے گی اور ہمارا نام غداروں، بے وفاؤں اور قوم دشمن جماعتوں کی فہرست میں ہوگا اور ہم اسلاف و اکابر کے ارادے اور عزائم کو ملیا میٹ کرنے والے ہوں گے۔

زعفرانی رنگ

چند دن قبل اخبارات میں وزارتِ امور حکومتِ ہند کی جانب سے قومی پرچم کے سلسلے میں جو ہدایات اور قانونی احکام جاری کئے گئے تھے، جن کے اکثر احکام وقوانین سے تو راقم الحروف کو کچھ حد تک اتفاق ہے، لیکن اس میں ایک ہدایت ایسی بھی ہے جو ہندو انتہاء پسند تنظیموں اور بی جے پی کی خفیہ سازشوں کا غماز ہے، اس میں لکھا ہے کہ ”قومی پرچم میں زعفرانی رنگ کو اوپر رکھیں“ آخر اس ہدایت کی

کیا ضرورت؟ اس سے **حکومت** ہند کے دلی اور فکری جذبات کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اس کے تحت جو دیگر قوانین بنائے گئے ہیں، وہ اسی زعفرانی رنگ کی وجہ سے بنائے گئے ہیں اور دیگر مذہب والوں بالخصوص مسلمانوں کے دِلوں میں ہندوتوا کے متعلق زعفرانی رنگ کی حیثیت، اس کی عظمت و تقدس اور اس کا مقام و مرتبہ واضح ہو جائے اور یہ ان کے دِلوں میں اپنی جگہ بنالے اور وہ ان کا مذہبی عقیدہ کمزور کر دے اور یہ دراصل مسلمانوں کے ایمان اور ان کے عقیدے کا سودا کرنا ہے۔

یہ کوئی نیا کھیل نہیں ہے

یہ آج ہی سے نہیں بلکہ جب سے آر ایس ایس کی بنیاد پڑی ہے، اسی وقت سے اس طرح کی سازشیں رچی جا رہی ہیں، تقریباً ۱۹۲۴ء میں جب اس کی بنیاد پڑی تھی، تو اس کے بعد ہی اخبارات میں ان کے اس طرح کے عزائم و مقاصد شائع ہوئے تھے کہ ہر جگہ ہندو کلچر کو عام کیا جائے، مدارس کے سامنے مخرب اخلاق چیزوں کی دُکانات لگائی جائیں، مدارس میں بے حیائی کو عام کیا جائے اور اسکول میں ہندو لڑکے اور لڑکیاں اپنے مسلم دوست لڑکے اور لڑکیوں کو جنسی فساد کی طرف مائل کریں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی شائع ہوا تھا کہ ہر جگہ راستے اور چوراہے پر ہندوؤں کے گذرے ہوئے مہاسپوتوں کے مجسمے نصب کئے جائیں، تا کہ مسلمان ان سے مرعوب ہوں اور ان کی عظمت ان کے دِلوں میں بیٹھ جائے، لیکن اس وقت ان کے دِلوں میں ہندوستان کا مستقبل یعنی اس کی آزادی کا خیال بھی نہیں آیا، تو وہ اس وقت ضرور کہتے کہ قومی پرچم کو ہندوتوا نظریے کے مطابق بنایا جائے اور زعفرانی رنگ اسی وقت اس میں شامل کر دیا جاتا، لیکن افسوس کہ اس وقت ان کو ہندوستان کی آزادی کا خیال بھی نہیں ہوا اور انہوں نے اس آزادی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں کہ ہندوستان کبھی آزاد ہوں گے اس لئے کہ وہ تو ہندوستان کے غدّار اور انگریزی سامراجیت کے موافق اور مددگار تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا نہیں کیا، لیکن پچپن سال گذرنے کے بعد بھی انہوں نے قومی پرچم میں زعفرانی رنگ چڑھا ہی دیا اور اس طرح وہ ہندوتوا نظریہ کو عام کرنے لگا۔

ترنگا سے مراد کیا ہے؟

بچپن میں میں نے پٹنہ کی مطبوعہ ہندی کتاب ”بال بھارتی“ میں پڑھا تھا اور اپنے استاد کی زبانی سنا بھی تھا کہ ترنگا سے مراد مجاہدینِ آزادی کے عزائم و مقاصد ہیں اور اس کے اوپر والے **رنگ**

سے مراد شہداءِ جنگ **کا عزم و حوصلہ ہے**، اور وہ یہ حوصلہ لے کر لڑ رہے تھے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی جانوں کو قربان کر دیں گے اور اپنے قیمتی خون سے اس گلستاں کو سیچیں گے اور سفید کپڑے کی پٹیوں کو اپنی پیشانیوں پر باندھے ہوئے تھے کہ جب تک ہم آزادی حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک ہم لڑتے رہیں گے اور چین کی سانس نہیں لیں گے تا آں کہ ہماری روح ہمارے بدن سے نکل جائے اور ہم ان سفید کپڑوں میں دفن کر دیئے جائیں، جس کی وجہ سے بیچ میں سفید رنگ کا انتخاب ہوا اور ہرا رنگ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہماری قربانیوں کے نتیجہ میں یہ ہندوستان آزاد ہو کر سر سبز و شاداب اور ہرا بھرا ہوگا جس کا غماز ہرا رنگ ہے۔

لیکن ان قوم دشمن غداروں نے اپنے اسلاف کی تاریخ کو بھلاتے ہوئے قومی پرچم کے رنگ کو بھی بدلنا شروع کر دیا ہے، ہے کوئی جوان غداروں کی اصلاح کرے، ان کو اس طرح کے حرکات کے ارتکاب سے روکے اور ان کو اس سے باز رکھ سکے؟

جرأت ہے جس کے پاس وہی فتح مند ہے * دشمن جھک جائے گا اگر ہمت بلند ہے

یہ قومی پرچم کیا ہے؟

قومی پرچم حکومتِ ہند کی ایک نشانی اور علامت ہے اور دوسرے ممالک سے امتیاز کا ذریعہ ہے، جس طرح کہ اور ملکوں کی نشانیاں ہوا کرتی ہیں اسی طرح سے یہ پرچم اس ملک کی نشانی ہے، اگر کوئی اس کی بے حرمتی کرتا ہے، تو اس سے ڈائریکٹ حکومت کی بے حرمتی ہوتی ہے، اسی وجہ سے کوئی کسی حکومت کے خلاف احتجاج یا مظاہرہ کرتا ہے، تو وہ اس حکومت کے جھنڈا کو نذرِ آتش کرتا ہے، جس سے اس بات کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ ہم فلاں حکومت یا اس کے فلاں قانون کے مخالف ہیں اور وہ اس کے ذریعے اس حکومت یا اس شخصیت کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے مطالبے کو پورا کرے، اس لئے قومی جھنڈا کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور حکومت اس کی بے حرمتی کو برداشت نہیں کر سکتی ہے، جس کی وجہ سے قومی جھنڈا کی حفاظت اس کا ادب و احترام تمام ہندوستانیوں کی اہم ذمہ داری ہے، لیکن اس کے ادب و احترام اور عظمت و تقدس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی سیاسی جماعت یا مذہبی تنظیم کو اپنے مقاصد و عزائم اور ارادے کو بروئے کار لانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جیسا کہ بی جے پی حکومت اور ہندو انتہاء پسند تنظیمیں اس سے اپنا ہندوتوا نظریہ اور زعفرانی مقصد کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔

اقوام متحدہ اور اس کی جانبدارانہ کارکردگی

یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو انسانوں سے بسایا ہے، تو اس کا یہ دستور رہا ہے، کہ ہر زمانہ اور ہر عہد میں ایک قوم دوسری قوم سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ایک خاندان دوسرے خاندان سے لڑتا رہا ہے اور آپس میں اختلاف وشورش نے جنم لیا ہے، نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب قوم معمولی معمولی باتوں پر ہزار ہا سال مسلسل انتقام کے جزبہ سے لڑتی رہتی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نبی لولاک ﷺ کو مبعوث فرمایا، تو آپ نے ان مدت ہائے درازتک جاری لڑائیوں کو بالکل ہی ختم کر دیا اور اس جنگجو قوم کو ایسی پاکیزہ صفت کا حامل انسان بنادیا کہ وہ اس کے بعد بھائیوں کی طرح رہا کرنے لگے اور لڑائی کا خیال بھی ان کے ذہن ودماغ میں نہیں آتا تھا۔

یہودیانِ مدینہ کی سرکشی

یہ آپ ؐ کی تعلیم وتربیت ہی کا تو اثر تھا کہ جس کو دنیا نے قبول کیا، لیکن اسی زمانہ میں بعض قومیں نبی ﷺ کی دعوت کو ٹھکرا کر آپ کے اور آپ کے اصحاب کے خاتمہ کے درپے ہوگئیں اور ہر ممکن ان کے وجود کو مٹانے کی تدبیریں کرنے لگیں، اس کے لئے انہوں نے دشمنانِ اسلام کفار ومشرکین کا ساتھ دیا اور بارہا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کی خلاف ورزیاں کیں، بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع جو آپ کے حلیف اور معاہد تھے، انہوں نے مختلف موقعوں پر دشمنوں کا ساتھ دیا اور ان کے علاوہ دوسرے قبائل نے بھی نبی اکرم ﷺ سے کئے گئے معاہدہ کی پاسداری نہیں کی اور معاہدہ کو توڑ کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے، چنانچہ ان کی اسی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ان کو مدینہ خالی کر دینے کے لئے کہا، جنہوں نے اس حکم کی تعمیل کی، تو ان کی جان ومال دونوں بچ گئے اور جو سرکشی کو اختیار کرتے ہوئے مقابلہ پر اتر آئے، تو پھر ان کے ساتھ قتل وقتال کا معاملہ کیا گیا اور اس طرح سے بعض کو

انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ جلاوطن کیا یا پھر ان کے لڑاکو اور جنگجو جوانوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا، اس کے بعد جب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے پورے جزیرۃ العرب سے ان کو پاک کردیا۔

اب کے یہود اور ان کے جذبات

یہی وہ ذلت و رسوائی کی بنیادی باتیں ہیں، جو ان کو بار بار یاد آتی رہتی ہیں اور ان کے اندر اس ذلت و ہزیمت کے انتقام کا جذبہ ابھرتا رہتا ہے اور وہ انہی اسباب و جودہ کی بناء پر ہمیشہ اسلام کے خلاف صف آرا رہے اور اپنے سابق مقام و مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہے اور ہمیشہ سے ان کے اندر یہ جذبہ موجزن رہا کہ کسی طرح پھر دوبارہ مدینہ پر ان کا قبضہ ہو جائے، اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے بالکل عرب علاقہ فلسطین میں اسرائیلی اسٹیٹ قائم کیا، جس نے دھیرے دھیرے خیبر تک اسرائیلی سرحد کا دعویٰ کر دیا، پھر وہ اپنے منصوبہ کے تحت اسرائیلی اسٹیٹ میں مدینہ کی شمولیت کا بھی دعویٰ کر بیٹھیں گے، اس کے لئے وہ مختلف انواع و اقسام کے طریقے اختیار کرتے ہیں اور جہاں کہیں بھی ان کو موقع ہاتھ آتا ہے، تو وہ مسلمانوں کو انتہائی ذلت و جارحیت کے ساتھ ختم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، چنانچہ وہ ابتداء ہی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے آئے ہیں، جس کی تاریخ شہادت دیتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ اور اقوام متحدہ کی بنیاد

جب دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ ہوا اور ایک بار پھر ان کو بُری طرح شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، تو اس کے بعد انہوں نے منظم اور باضابطگی کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کے لئے اقوامِ متحدہ کا پُرفریب ادارہ قائم کیا، جس کے خفیہ مقاصد میں سے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنا ہے اور اپنی سابقہ ذلت و رسوائی کا بدلہ لینا ہے، لیکن وہ ان مقاصد کو ہمیشہ سے چھپاتے رہے اور بظاہر خیر خواہانہ مقاصد کے ذریعہ انہوں نے دیگر اقوام و ملل کو اپنے گرد و پیش جمع کیا اور دنیا کے سامنے اس بات کا تأثر دیا، کہ یہی وہ واحد ادارہ ہے جو پوری دنیا کا بلا لحاظ قوم و ملت نمائندہ ہے، یہ عدل و انصاف، چین و سکون، صلح و آشتی اور امن و امان کا گہوارہ ہے، ظلم و ستم کا مخالف ہے اور مظلوم، بے بس، کمزور اور نہتے آدمیوں کی مدد

کرنا اس کا اولین فریضہ ہے، لیکن جب آپ اس ادارہ کی پوری تاریخ کا بغور جائزہ لیں گے، تو یہ بات آپ کے سامنے آشکارہ ہو جائے گی کہ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کے مقاصد تو صرف عالمِ اسلام اور مسلمانوں کو نہتا اور کمزور کرنا ہیں، تاکہ پوری دنیا سے اسلام کا بول بالا ختم ہو جائے اور ہر جگہ اس کی شیطانی حکمرانی ہو۔

اقوام متحدہ اور اس کا جانبدارانہ رویہ

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی مسلم ملک پر کسی حملہ آور نے اپنی جارحیت کا مظاہرہ کیا، تو اس بین الاقوامی ادارہ نے حملہ آور کو اس سے روکا نہیں اور اس کو ظلم وستم اور جارحیت سے باز نہیں رکھا، چیچنیا میں مسلمانوں کی روس کے ہاتھوں قتل وغارتگری، فلسطین پر اسرائیل کی درندگی، ہیروشیما، لیبیا اور افغانستان پر امریکہ کی بمباری، ان میں سے کون سا ایسا ملک ہے؟ جس کو اس بین الاقوامی ادارہ نے بزور طاقت یا کسی بھی طرح روکا ہو، اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو، یا اس پر تحدیدات عائد کی ہوں، ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے حملہ کو روکنے کی بے حد کوشش کی ہے اور کسی اسلامی ملک کے حملہ کو دوسرے ملک پر برداشت نہیں کیا ہے، اس نے عراق وایران اور کویت وعراق لڑائی میں ضرور دخل اندازی کی ہے، اس کے علاوہ عراق وافغانستان اور پاکستان پر مظلومانہ تحدیدات عائد کر کے ان کی ترقی کے راستے کو مسدود کر دیا، بیرون ممالک سے تعلقات قائم ہونے نہیں دیا اور ان پر ہر طرح کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کی کھلی چھوٹ دے رکھی، اس کے برخلاف اس ادارہ کی جانب سے اسرائیل، روس اور امریکہ میں سے کسی ملک پر تحدیدات عائد نہیں کی گئیں، بلکہ ان کو اس کے لئے ہر طرح کے مواقع فراہم کئے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔

اقوام متحدہ اور مسئلۂ عراق

اسی طرح سے آج امریکہ اور اس کا اتحادی عراق پر اپنی جارحیت کا مظاہرہ کر رہا ہے، اس پر بمباری کر رہا ہے اور پوری دنیا اس حملہ آور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہے، لیکن اقوام متحدہ اس کے خلاف خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے اور عراق کی تائید اور امریکہ کی مذمت بیان کرنے سے قاصر نظر آرہا ہے............ اس کے برخلاف وہ مابعد عراق جنگ اور وہاں اپنی فوج متعین کرنے پر غور وفکر کر

رہا ہے،عراق کی تعمیرنو کے بارے میں سوچ رہا ہے، انسانی راحت کاری کے لئے منصوبے بنا رہا ہے اور وہ اس کے لئے اسکیمیں تیار کر رہا ہے، لیکن یہ تمام کام صرف اسی خفیہ سازش کے پسِ منظر میں ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کو عراق سے ہمدردی ہوتی، تو وہ امریکی بمباری کو ضرور روکتے، اس کو عراق سے زبردستی باہر نکال کرتے، اس کے علاوہ اس پر تحدیدات عائد کرتے، لیکن اس کے اس رویہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اس کو عراق پر بمباری سے کوئی مطلب نہیں اور وہاں کی بے قصور اور معصوم جانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف عراقی قائد صدام حسین کے خاتمہ سے مطلب ہے اور تا کہ عراق میں اس کی مرضی کے مطابق اس کے حواری کی کٹھ پتلی حکومت قائم ہو سکے اور رفتہ رفتہ وہاں کے مسلمانوں کے دلوں سے ان کی قیمتی دولت ایمان کو خریدا جا سکے، جس کے لئے وہ اتنا پاپڑ بیل رہا ہے۔

اقوام متحدہ کی اصلیت اور ہماری ذمہ داری

اقوام متحدہ تو دراصل دشمنانِ اسلام کفار ومشرکین کا متحدہ محاذ ہے، جس کے تحت وہ مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور پوری دنیا پر اپنی شیطانی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے، چنانچہ پورے عالمِ اسلام کو چاہئے کہ وہ اپنے دشمنوں کے منصوبے کو سمجھیں اور ان کے بہکاوے میں نہ آویں اور اس کے علاوہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ایک پلیٹ فارم تیار کریں جس پر وہ جمع ہو کر ان کا مقابلہ کر سکیں اور وہ اس ڈینگ مارنے والے ادارہ اقوامِ متحدہ پر اعتماد نہ کریں، اور یہ نہ سوچیں کہ یہ ہمارا خیر خواہ ہے اور یہ ہمیں ہمارے دشمنوں سے نجات دلائے گا، اس لئے کہ اس کی بنیاد کے اول دن سے جو اس کا جانبدارانہ رول رہا ہے، وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔

***

سقوطِ بغداد اسلامی ممالک کے لئے ایک انتباہ

بغداد اور طاغوتی طاقت

عراق کی تاریخ میں بغداد نے کئی بار اپنے عروج و زوال کے مناظر کو دیکھا ہے، بغداد کئی بار بسایا گیا اور ساتھ ہی وہ کئی بار اجاڑا بھی گیا ہے، بغداد کی قدیم تاریخ ہے، وہ مملکتِ اسلامی، اسلامی علوم وفنون اور سیاسی اُمور کا آماجگاہ اور مرکز رہ چکا ہے، وہاں بے شمار قوموں نے اپنا جبری تسلط قائم کرنا چاہا، لیکن ان کے اس جبری تسلط کو دوام و بقاء حاصل نہ ہو سکا اور کچھ ہی دنوں میں وہ بُری طرح راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں ...... موجودہ سقوط بغداد اسلامی تاریخ کا بدترین باب ہے، اس سے پہلے بغداد کبھی بھی اس طرح کی وحشت و بربریت، ظلم وتشدد اور جارحیت کا نشانہ نہ بنا تھا، ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ حملہ آوروں نے اپنی بے انتہاء درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانی، مالی اور قسم قسم کے نقصانات پہونچائے تھے، لیکن اس طرح شہروں، بازاروں، ہسپتالوں، سڑکوں، پانی کے نلوں اور مکانات کو تباہ و برباد اور تخت وتاراج نہیں کیا تھا اور اس طرح لمحوں میں عالیشان، بلند وبالا اور خوبصورت عمارتوں اور محلات کو خاکستر نہیں کیا تھا۔

عرب، مادیت اور صیہونی سازش

اسلام دشمن طاقتیں ابتداء ہی سے اسلام کے خلاف صف آراء رہی ہیں اور وہ شروع ہی سے اس بات کی کوشش کرتی چلی آرہی ہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور مادی قوت و وسائل کو ختم کر دیا جائے، اس کے لئے وہ مختلف طریقے اختیار کرتے آئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے اسی اصول پر کار بند رہتے ہوئے اپنی مکاری، چالبازی اور فریب کے ذریعہ لاکھ کوششوں کے نتیجہ میں عرب ممالک کو ٹکڑیوں

میں بانٹ دیا، ان کی اجتماعیت کے شیرازہ کو بکھیر دیا، ان کو عیش پسندی اور راحت طلبی کے راستے دکھائے اور اس طرح انہوں نے عرب ممالک کی اجتماعیت اور ایمانی طاقت وقوت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور اس طرح ان کے درمیان اختلاف وانتشار کو ہوا دی کہ ان کا پھر دوبارہ متحد اور مجتمع ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا۔

عرب کی بے وقوفی اور دشمن کی چالبازی

دوسری طرف انہوں نے مادی طاقت وقوت کو عرب ممالک سے برابر دور رکھنے کی کوششیں کیں، اس کے علاوہ وہ ان کے مادی وسائل کو ہمیشہ کمزور کرنے کی فکر میں رہے اور اس کے لئے انہوں نے دو طریقۂ کار اختیار کیا، اول تو عربوں کو اس بات کا تأثر دیا کہ ہم تمہارے حلیف، دوست اور محافظ ہیں، تمہیں مادی طاقت وقوت اور وسائل کے اختیار کرنے کی قطعا کوئی ضرورت نہیں ہے، تم اس بات سے بالکل مامون اور مطمئن رہو کہ کوئی بھی تم پر حملہ کرے گا، اس لئے کہ تمہارا کوئی دشمن ہی نہیں ہے، لیکن اگر پھر بھی کسی طرح کسی نے تمہارے اوپر حملہ کر دیا، تو ہم تمہاری ہر طرح سے جانی اور مالی مدد کریں گے، ہم تمہارے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گے اور ہم تمہارے بدلہ ان سے مقابلہ کریں گے، لہٰذا تمہیں ہتھیار وغیرہ بنانے کی کوئی حاجت وضرورت نہیں ہے، اس طرح سے وہ مکار عرب ممالک کو اپنے دامِ فریب میں لینے میں کامیاب ہو گیا اور عرب ممالک بھی ان دشمنوں کے نرغے میں آ گئے۔

بعض عرب مخالفین اور ان کا انجام

اس کے برخلاف جن مسلم ممالک نے ان مکاروں کی چال کو سمجھا، ان سے اختلاف کیا اور ان کے اس پُرفریب رائے اور مشورہ کو خاطر میں نہ لا کر ٹھکرا دیا اور اس کے علاوہ انہوں نے ذرہ برابر بھی اپنی طاقت وقوت کو مضبوط کرنا چاہا، تو ان کی نظریں ان پر جمی رہیں اور وہ ان ممالک کو اپنے زیرِ اقتدار اور ماتحتی میں کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے رہے، ان کو ڈرایا، دھمکایا، اس کے علاوہ ان کو حرص و طمع دے کر اپنے زیرِ اقتدار آنے کی دعوت دی، جب اس طرح وہ کامیاب نہ ہوئے اور اپنی محنت وکوشش کو رائیگاں ہوتے دیکھا، تو بالآخر حملہ کی دھمکی بھی دے دی، جب دھمکی سے بھی وہ قابو میں نہیں آئے، تو

بالآخر ان ممالک پر حملہ کر ہی دیا اور اس کے بعد وہاں انہوں نے اپنی بے انتہاء وحشت و بربیت کا مظاہرہ کیا اور اس کی مثالیں ماضی میں بہت ساری ملتی ہیں۔

عراق پر حملہ اور اس کی حالت زار

ماضی قریب میں ان کو طالبان سے خطرہ لاحق ہوا، تو اسامہ کو بہانہ بنا کر افغانستان پر ہلاکت خیز بمباری کردی اور وہاں اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر کے سانس لی، اس کے بعد عراق وہ واحد مسلم اور عرب ملک تھا، جس کو کچھ طاقت وقوت حاصل تھی اور اس سے ان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا، تو صدام کو بہانہ بنا کر عراقی طاقت کو ختم کرنا چاہا، دھمکیوں سے بھی کام لیا اور بار ہا اس کو الٹی میٹم دے کر اپنے زیرِ اقتدار آنے کی دعوت دی، جب اس طرح بھی کام نہ بنا، تو بالآخر ۲۵ ر مارچ کو عراق پر زبردست اور بڑے بھاری پیمانے پر حملہ کر ہی دیا، وہاں ہفتوں بمباری کی، اسلامی کتب خانوں اور دینی کتابوں کو نذرِ آتش کیا اور وہ دن بھی آ ہی گیا، کہ وہاں کے امن و امان اور چین وسکون کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی، اس طرح ایک اسلامی مملکت پر اسلام دشمن طاقتوں کا جابرانہ تسلط و اقتدار قائم ہو گیا اور اب وہ وہاں جیسے چاہتے ہیں من مانی کرتے پھر رہے ہیں اور ان کو کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہے اور اب بغداد کا کیا حال ہوگا؟ وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور یہ کہ وہ وہاں ٹِک بھی سکیں گے یا نہیں اور کہیں ان کا بھی حال سابقہ حملہ آوروں کی طرح نہ ہو، کہ انتہائی ذِلت و رُسوائی اور ہزیمت کے ساتھ بغداد سے نکلنا پڑے (اللہ کرے ایسا ہی ہو)

اسلامی ممالک اور ان کا مستقبل

یہ تو ان کے مقاصد تھے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے اس طرح حملہ کرتے رہے ہیں، اور اب آئندہ عالم اسلام کا کیا حال ہوگا؟ اور ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا؟ وہ خدا ہی خوب جانتا ہے، مگر ظاہری اور موجودہ حالات سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح یکے بعد دیگرے اسلامی ملکوں پر حملہ کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کے وجود کو دنیا سے مٹانے کی کوشش میں ہمیشہ لگے رہیں گے۔

سقوطِ بغداد اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں بالخصوص اسلامی

ممالک کے لئے ایک بہت بڑا انتباہ ہے اور یہ ان کے متحد و متفق ہونے کے لئے ایک مہلت ہے، کہ ابھی بھی تم سب سُدھر جاؤ اور اللہ کی طرف رجوع کرو، دیکھو تمہاری ہی سرزمین پر غیروں کا تسلط ہے، وہ بھی نجس غیر مسلموں کا، دیکھو جس اللہ نے تمہیں ملک وسلطنت عطا کیا ہے، تو وہی اللہ اس کو تمہارے ہاتھوں سے چھیننا بھی جانتا ہے، اس لئے تم اس بات سے مامون اور مطمئن نہ رہو کہ یہ ملک وسلطنت سدا تمہارے ہاتھوں میں رہے گی، بلکہ اگر تم نے اس نعمت کا صحیح استعمال نہیں کیا، تو وہ اللہ یہ حکومت چھین کر دوسروں کو بھی دے سکتا ہے، پھر وہ تمہارے اوپر جابرانہ حکمرانی کریں گے اور پھر قرآنی صداقت تمہاری سمجھ میں آئے گی (اس سے اشارہ قرآنِ کریم کے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۶ کی طرف ہے) پھر تم جب مجھے پکارو گے، مجھ سے مدد طلب کرو گے، تو میں تمہاری پکار کو سنوں گا اور نہ ہی تمہاری مدد کروں گا، اس لئے ابھی بھی تم ہوش میں آجاؤ۔

***